پیدا تی ہے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس سے اوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ فائدہ اٹھائیں،

اردو میں تنقید - از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۸۲ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عہ، پتہ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ،

یہ لائق مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں آزاد، حالی، شبلی اور عبد الحق کی تنقیدی مساعی کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ اور آخر میں "اردو تنقید کا مستقبل" کے عنوان سے ایک مقالہ ہے جس میں کلیم الدین احمد صاحب سے اردو تنقید کے خوشگوار مستقبل کی امید وابستہ کی گئی ہے، مصنف نے اگرچہ مذکورہ بالا ناقدین کی تنقیدی خدمات کی داد دی ہے، اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مگر ان کی خوبیوں کے مقابلہ میں خامیوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی تحریر میں اعتدال و توازن قائم نہیں رہ سکا۔ اور تنقید کا لہجہ جا بجا درشت ہو گیا ہے، آزاد اور شبلی کے خیالات سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو مگر ان کے علمی و ادبی خدمات اور ان کی عظمت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، جس کا اعتراف خود مصنف کو بھی ہے، اس لیے ایسے اساطین ادب کے مقابلہ میں اس قسم کا لہجہ مناسب نہیں ہے، مگر مصنف کے حسن نیت میں شبہہ نہیں، انھوں نے تلاش و محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اور اس سے ان کی جدت و ذہانت کا پتہ چلتا ہے،

لغات القرآن جلد ششم } تالیف مولانا سید عبد الدائم الجلالی، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت معیاری، صفحات ۴۳۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، غیر مجلد للعہ

ناشر ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی،

اس مفید کتاب کے پانچ حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں جن پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، اس آخری حصہ میں بھی وہ خصوصیات موجود ہیں جو پہلی جلدوں میں تھیں، اللہ تعالیٰ ناشر اور مولف کو اس خدمت قرآنی کا اجر اور مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

"ض"

جلد ۸۴ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۹ء نمبر ۲

مضامین

شذرات

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے دینی مدارس اور اسلامی ادارے جن مشکلات میں مبتلا ہیں، وہ سب پر عیاں ہے، مگر یہ شکر و مسرت کا مقام ہے کہ ان مخالف حالات میں بھی الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء روز افزوں ترقی پر ہے، اسکی تعلیمی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ہے، چنانچہ اس وقت دارالعلوم میں مختلف اسلامی بلکہ خاص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ زیر تعلیم ہیں، عام طلبہ کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ پرانی اقامت گاہیں ان کے لیے ناکافی ہو رہی ہیں اور شبلی ہوسٹل کی وسیع عمارت کو دو منزلہ کیا جا رہا ہے، اس کا ایک حصہ رواق رحمانی کے نام سے بن چکا ہے اور دوسرے حصہ رواقِ سلیمانی کی تعمیر عنقریب شروع ہونے والی ہے، اساتذہ کے لیے چند کوارٹر بن گئے ہیں، دارالعلوم کی ترقی کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے تنظیم و ترقی کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا ہے جو نہایت مستعدی اور سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے،

دینی اصلاح و ترقی کے لیے یہ سند کافی ہے کہ دارالعلوم تبلیغی جماعت کا ایک اہم مرکز ہے۔ ابھی حال میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد ایسا اسلامی لٹریچر پیدا کرنا ہے، جو موجودہ مادی و لادینی تہذیب کے پیدا کردہ فتنوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنی ارتداد کا تدارک اور ان میں ایمان و یقین کا نور پیدا کر سکے، اور جدید نسل کے دماغوں کی تسکین کا سامان فراہم اور عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جو غیر مسلم اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیں انکے سامنے اسکی صحیح تصویر پیش کر سکے، اس فرض کفایہ میں شرکت ان تمام اصحاب علم و قلم کا فرض ہے جو اس کام کی اہلیت رکھتے ہیں،

دارالعلوم کے بعض تعلیم یافتہ نوجوان کچھ عرصہ سے البعث کے نام سے عربی کا ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ یہ ہندوستان میں تنہا عربی کا علمی و دینی رسالہ ہے جو عرب ملکوں میں بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور وہ ان ملکوں سے ربط و تعلق اور ان میں دارالعلوم کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کا موثر ذریعہ ہو سکتا ہے، اس لیے دارالعلوم عنقریب اس رسالہ کو اپنی تحویل میں لینے والا ہے، خوبصورت ٹائپ کا ایک پریس قائم کیا گیا ہے جس میں کتابیں چھپنے لگی ہیں، اور ابھی اسکی مزید توسیع و ترقی پیش نظر ہے، غرض اس وقت دارالعلوم ہر حیثیت سے الحمدللہ ترقی پر ہے اور یہ سب ہماری جماعت کی لائق فخر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ کے اخلاص و للّٰہیت کا فیض ہے، ندوہ کے خدام و متوسلین کا جو کام ہے اس کو وہ پورا کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ مسلمان قوم کے بھی کچھ فرائض ہیں، سر دست رواق سلیمانی کی تعمیر اور بعض ضروریات کے لیے سرمایہ کی بڑی ضرورت ہے، ہم کو توقع ہے کہ مسلمان اصحاب ثروت اس کار خیر میں پوری مدد دیں گے۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا محض تعلیمی نہیں بلکہ قومی و ملی ادارہ بھی ہے، اس لیے اس کا شعبۂ دینیات باوقار ہونا چاہیے، اس کا کام محض مقررہ نصاب پڑھا دینا نہیں بلکہ یونیورسٹی میں دینی فضا اور دین کا وقار قائم کرنا بھی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اسکی جانب توجہ کریں، شعبۂ دینیات کو پوری اہمیت دیجائے اور اس کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جنکی علمی و دینی شہرت مسلم ہو، ہم کو خوشی ہے کہ اب اس شعبہ کی صدارت کے لیے ہمارے فاضل دوست مولانا سید احمد صاحب اکبرآبادی کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں وہ تمام اوصاف و شرائط موجود ہیں، جو اس عہدہ کے لیے درکار ہیں، اس سے نہ صرف اس شعبہ کا وقار قائم ہوگا بلکہ یونیورسٹی کی علمی و دینی فضا پر بھی اس کا اثر پڑے گا، شعبۂ فارسی کے ریڈری کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا انتخاب بھی نہایت موزوں و مناسب ہے، وہ صحیح معنوں میں اسکالر ہیں، علم کا سچا ذوق رکھتے ہیں اور مرد مسلمان بھی ہیں، اور آیندہ محققین کی صف میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

مسلم یونیورسٹی کو ایسے اساتذہ نہیں چاہئیں جن کا مایۂ فخر محض ڈگریاں، نمود و نمایش کی زندگی اور

اپنی دینی و ملّی روایات سے آزادی و بیزاری ہو، بلکہ ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو علم کا صحیح ذوق رکھنے کے ساتھ قومی و ملی جذبہ بھی رکھتے ہوں، اور جن کی زندگی علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے نوجوانوں کے لیے نمونہ ہو۔

سرسید احمد خاں نے جس زمانہ میں علیگڈھ کالج قائم کیا ہے، اس زمانہ میں کالجوں کی کمی نہ تھی، مگر ان کی تعلیم، ان کا مقصد اور ان کا ماحول مسلمانوں کی ملّی ضروریات کے مطابق نہ تھا، اور سرسید احمد خاں کی دوربیں نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان جس راہ پر جا رہا ہے اگر اس میں مسلمانوں کی جدید تعلیم کے ساتھ ان کی ملّی خصوصیات کے تحفظ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ان کا قومی وجود ختم ہو جائے گا، اسی مقصد کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے لیے الگ کالج قائم کیا تھا، حالانکہ جس زمانہ میں کالج قائم ہوا ہے اس زمانہ میں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی، مگر انکی ایک حیثیت قائم تھی، اور ان کی تہذیبی خصوصیات بھی بہت کچھ باقی تھیں، اور اب آزاد ہندوستان کے مستقبل کا جو نقشہ ہے اور مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں، ان میں ان کے لیے سرسید احمد خاں کے زمانہ سے کہیں زیادہ خطرات ہیں، اس لیے مسلم یونیورسٹی کو اس کی ملی خصوصیات پر قائم رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے،

یہ نہیں کہا جاتا کہ یونیورسٹی سے پرانی خصوصیات بالکل ختم ہو گئی ہیں یا وہ دینی و ملّی جذبہ رکھنے والے اساتذہ سے بالکل خالی ہو، لیکن ان کے ایک طبقہ میں دین و ملت سے آزادی کے جو رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور جس کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا ہے، وہ یونیورسٹی کی روح اور اس کے مقاصد کے سراسر خلاف ہیں، اور ان کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ اگر اس کی اصل روح ختم ہو گئی تو مسلمانوں کے لیے اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہ جائیگا

مقالات

امام حسن بن محمد الصّغانی لاہوری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۷)

رضیہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے صغانی کو ہندوستان کا قیام پسند نہیں رہا اور آپ ۶۳۴ھ میں حج کے ارادہ سے حجاز روانہ ہو گئے، یہ بات وثوق سے تو نہیں کہی جا سکتی کہ آپ نے اسی سال حج کیا یا ۶۳۵ھ میں یہ سعادت نصیب ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ صفر ۶۳۵ھ تک آپ کا قیام حجاز ہی میں رہا، کیونکہ آپ نے یہیں رہ کر تکملۃ الصحاح کو مکمل کیا تھا، آستانہ (ترکی) میں صغانی کے قلم کا لکھا ہوا تکملۃ الصحاح کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے خاتمہ پر تحریر ہے،

فرغ من تالیفه امام بیت الله	مولف اس تکملہ کی تالیف سے بیت اللہ شریف
الحرام صبیحة یوم الجمعة وقت	کے سامنے صبح کو جمعہ کے دن بیت اللہ کا
فتح باب بیت الله الحرام العاشر	دروازہ کھلنے کے وقت دس صفر ۶۳۵ھ
من صفر سنة خمس وثلاثین	کو فارغ ہوا،

۱؎ ملاحظہ ہو تہذیب الصحاح (مقدمہ از عبد الغفور عطار طبع دار المعارف مصر ۱۳۷۱ھ ص ۹۴ وصحاح اللغۃ للجوہری کا مقدمہ احمد عبد الغفور عطار) دار الکتاب العربی مصر ۱۹۵۶ء ص ۱۲۹

صحاح جوہری کا تکملہ پورا کرنے کے بعد حجاز سے ہندوستان واپس آگئے،

اسلام نے چونکہ عورت کو امام اور خلیفہ کے اختیارات کا مستحق قرار نہیں دیا ہے، اس لیے اہل علم نے رضیہ کی حکمرانی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا، اسی لیے صغانی کو بھی یہاں کا قیام پسند نہ تھا، چنانچہ اس کے تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد ہی یہاں سے رستگاری کی تدبیریں شروع کر دیں، لیکن رضیہ نے برسر اقتدار ہونے کے بعد خلافت بغداد سے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا تھا، اس لیے آپ کی خواہش کے باوجود آپ کو بغداد نہیں بلایا گیا، مگر صغانی یہاں کا قیام اپنے لیے ایک قید خانہ سے کم نہ سمجھتے تھے۔ (جیسا کہ آیندہ اشعار سے معلوم ہوگا) یہاں سے نکلنے کے لیے اپنے فرزندوں کو بھی لکھا، انھوں نے بھی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، اور خلیفہ مستنصر باللہ نے ان حالات میں آپ کو بغداد بلانا غالباً مصلحت کے خلاف سمجھا اور یونہی ڈیڑھ دو برس کی مدت گذر گئی، اس کے بعد ۶۳۷ھ میں آپ کو بغداد بلایا گیا، ان حالات سے متاثر ہو کر صغانی نے ۵۹ شعروں کا ایک قصیدہ لکھا، جو ہندوستان کی سرزمین میں عربی زبان میں ادبی طرز کا واحد قصیدہ ہے، اس میں صنائع لفظیہ و معنویہ اور الفاظ عربیہ کے باوجود یہ خوبی ہے کہ اس میں آپ نے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں، زمانہ کی سازگاری اور ناسازگاری کو بیان کیا ہے، اور شاعرانہ انداز میں آپ بیتی لکھی ہے، یہ پورا قصیدہ تجنیس[1] میں ہے اس لیے کچھ اشعار نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں

(۱) انسانی الدهر اعطانی داوطانی ... وحطنی وہاد الخسف اوطانی

زمانہ نے (میرے دل سے) میرے وطن اور میری نشست گاہوں (کی یاد) کو بھلا دیا اور مجھے قعر ذلت میں گرا کر روند دیا ہے

(۲) وکنت افنیت عمری فی رفاهیة ... فعطنی ولذیذ العیش انسانی

حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذاری۔ پھر اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور میری پسندیدہ اور مرغوب زندگی کو بھلا دیا

(۳) وکان قدمنی قدرا واکرمنی ... فالآن اخرنی غدرا وانسانی

حالانکہ اس نے میری بڑی عزت افزائی کی تھی اور میرا بڑا اکرام کرتا تھا اور اب اس نے مجھ سے بیوفائی کر کے مجھے چھوڑ دیا اور بھلا دیا۔

(۴) وکم غنیت بمغنی العز اشرف ... اجرفی المجد اذیالی واردانی

میں بہت سے عز و شرف کے مقامات میں رہا ہوں اور مجد و بزرگی میں اپنے دامن اور آستین گھسیٹتا رہا ہوں

(۵) لا استکین لسلطان ولا ملک ... بعظمه فردانی ثم اردانی

میں کبھی کسی سلطان اور بادشاہ کے آگے اس کے جاہ و جلال کی وجہ سے سرنگوں نہیں ہوا مگر زمانہ نے مجھے پارہ پارہ اور ہلاک کر دیا ہے

(۶) ردنی خائبا صفر الیدین لقیً ... من بعد ماکان بالترحیب حیّانی

اس نے مجھے گری پڑی چیز کی طرح نامراد اور خالی ہاتھ لوٹا دیا، حالانکہ وہ پہلے مجھے خوش آمدید اور عمر دراز باد کہہ چکا تھا۔

(۷) وکان احیاء هذا الصقع لی تبعاً ... فهل یدین من الاحیاء حیّان

اور اس زمین پر رہنے بسنے والے میرے فرمانبردار تھے، اب کیا دو قبیلے بھی میری اطاعت قبول کر سکتے ہیں اور فرماں بردار ہو سکتے ہیں؟

(۸) ومسنی بالیم الضر معتسفا ... لما طوی لی اعوانی واعیانی

اور اس نے ظلم پر کمربستہ ہو کر مجھے بڑی دردناک تکلیف پہنچائی ہے، اس نے میرے سرداروں اور ممتاز ساتھیوں کو مار ڈالا ہے

[1] صنائع لفظیہ کے اقسام میں سے ایک قسم کا نام صنعت تجنیس ہے، اسکی بھی کئی قسمیں ہیں جس میں ایک قسم تجنیس تام کہلاتی ہے، یہ ایسی صنعت ہے جس میں دو لفظ انواع حروف، اعداد حروف، ترتیب حروف اور حرکات و سکنات میں متفق اور معنی میں مختلف استعمال ہوتے ہیں، یہ پورا قصیدہ اسی صنعت پر مشتمل ہے۔

(۹) وکنت اعی زمانا عزة وسنا   فالآن جور زمان السوء اعیانی

میں زمانہ کو عزت اور وقار کے اعتبار سے تھکا چکا تھا، اور اب زمانۂ بد کے ظلم وستم نے مجھے تھکا مارا ہے

(۱۰) وکان لو خضعت نفسی لترضیة   القی القیاد فاعلانی و اسمانی

اور اگر میرا نفس اسکی رضا جوئی کیلئے آمادہ ہوگیا ہوتا تو قیادت میرے ہاتھ میں رہتی اور اس نے مجھے بام عروج پر پہنچایا ہوتا

(۱۱) وحین کنت حدیث السن ذا اشر   سنی عطائی واغنانی واسنانی

اور جس وقت میں نوعمر اور سربلند تھا تو اس نے مجھے انعامات سے سرفراز، مالا مال اور ممتاز اور نمایاں کیا

(۱۲) ثم انہ رانی اخیرا والتحی غصنی   من بعد ما نفضت للشیب اسنانی

پھر اس نے آخر میں مجھے حقیر اور ناکارہ سمجھا اور شاخوں (گوشت پوست) کو نوچنا شروع کر دیا، جبکہ

بڑھاپے کی وجہ سے دانت ہلنے شروع ہوگئے اور خراب ہوگئے

(۱۳) وکان دوحة عیشی غضّة زمنا   قصیرة ذات اغصان وافنان

اور میرے عیش کا برگ وبار والا درخت بہت تھوڑے زمانہ تک تر و تازہ رہا

(۱۴) وکنت مهما ارتجلت الشعر مقتضبا   یزری علی ابن ابی النهیٰ وحسّان

اور جس وقت میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا تو اس کے مقابلہ میں ابن ابی النهی اور (حضرت)

حسان رضؓ کے شعر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے

(۱۵) فالآن انی لاعی الناس قاطبة   مذ ضامنی وجمیع الضیم حسانی

اب میں تمام لوگوں سے زیادہ تھکا ماندہ ہوں، جب سے اس نے مجھ پر ظلم کیا اور ظلم کو مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے پلایا ہے

(۱۶) وکان قصری من وافاہ قال له   یا بانی القصر نعم القصر والبانی

اور میرا محل ایسا تھا کہ جو اس کو دیکھتا تھا، کہتا تھا کہ محل بنانے والا اور محل دونوں خوب ہیں،

(۱۷) فهدّه الدهر هدّ الانظام له   ضرب المعول غصن الطلح والبان

پس زمانہ نے جسکا کوئی اصول نہیں ہے اسکو منہدم کر دیا اور ایسی ضرب لگائی جیسے کدال والا ببول اور ران کی

(۱۸) ولی ببغداد دار العز دام بها   ظل الامام الراضی المستنصر ابنان

اور بغداد جو عزو شرف کا گھر ہے اس میں ہمیشہ ولعزیز خلیفہ مستنصر باللہ کا سایہ رہے وہاں میرے دو لڑکے ہیں

(۱۹) وهانا الآن کرها لا طواعیة   بالهند والسند ذو عدن وابنان[1]

اور میں اسوقت خوشی سے نہیں، مجبوری سے ہندوستان اور سندھ میں اقامت گزیں اور مقیم ہوں،

(۲۰) ان کان غیری فی خفض وفی دعة   یخلو بدف ومزمار وعیدان

میرے علاوہ اور لوگ عیش وعشرت میں ہیں اور خلوت میں دف، بانسری اور باجوں کے مزے لے رہے ہیں،

(۲۱) فلی من الدهر فی یومی ولیلته   من التهدد فی غیظ وعیدان

میرے لیے زمانہ کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں (ایک صبح اور ایک شام)

(۲۲) وکنت من قبل لو همّت بذ ائرة   صروف دهری علی حر اناالثانی

حالانکہ میں پہلے ایسا تھا کہ اگر زمانہ اپنی گردشیں کسی شریف اور آزاد مرد پر لانا چاہتا تو میں اسکا منہ پھیر دیتا تھا۔

(۲۳) امر عیشی ما قاسیت فی سفری   من بعد ما کان حلاه وحلانی

میری زندگی کا سب سے تلخ حصہ وہ ہے جو میں نے اپنے سفر میں گذارا، جبکہ اس سے پہلے زمانہ نے اسکو

خوشگوار اور شیریں تر بنا دیا تھا۔

(۲۴) معطلا جسمی المرهون منتقیا   من بعد ما کان حلاه وحلانی

اب وہ میرے نحیف وکمزور جسم کو بیکار کر چکا ہے، جب کہ پہلے اسکو سنوار اور مجھکو مزین کر چکا تھا

(۲۵) وعاد قوتی کفا من نوی حشف   وکان من صدر دراج وحلان

اور اب میری خوراک ایک مٹھی بھر کھجور رہ گئی ہو حالانکہ پہلے تیتر اور بکرے کے سینہ کا گوشت میری خوراک تھی،

(۲۶) یا قرتی عینی الندا بین ان تجدا   یدا الی فک ماسور فخلانی[2]

اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، شریف و دانا فرزندو! اگر تم میں ایک قیدی کے چھڑانے کی طاقت ہو تو تم مجھے چھڑا لو۔

---

[1] یہ اور اس سے پہلے والا شعر ہمارے اس دعوئی کی کہ یہ قصیدہ یہیں لکھا گیا ہے، نہایت بین دلیل ہے۔ [2] یہ شعر سلطانہ رضیہ کے دور قیام کی پوری پوری غمازی کر رہا ہے، اور اس دعوئی کی صریح دلیل ہو کر قصیدہ یہیں نظم ہوا ہے، اسی لیے ہم نے اسکو یہاں درج کیا ہے،

(۲۷) من بعد ما ربی طولا واکرمنی — قو لاوا جزل لی نولا وفتانی

اس کے بعد کہ زمانہ نے مجھے بڑی ناز ونعمت سے پالا، زبان سے بڑا اکرام کیا، بڑے بڑے انعامات سے نوازا، جوان کیا، طاقتور بنایا، جوانمردی اور سخاوت کا جامہ پہنایا،

(۲۸) حتی اذا صرت اخشی الذئب من کبری — الاذنی بصفیق الوجه فتان

یہانتک کہ جب میں بڑھاپے کی وجہ سے ایسی حالت میں ہوگیا کہ بھیڑیے سے ڈرایا جائے تو اس نے مجھے اپنے فتنہ انگیز چہرے کی پناہ میں لے لیا

(۲۹) وکنت من قبل من اودعته ذهبا — کانما حاطه للحفظ برجان

اور پہلے میں جس کے پاس سونا امانت رکھا تھا تو گویا اس کی حفاظت کے لیے دو برج ہوتے تھے،

(۳۰) والآن کل من استودعته اهباً — الص من سارق العربان برجان[1]

اور اب ہر وہ شخص جس کے پاس میں کچا چمڑا امانت رکھتا ہوں تو وہ عربوں کے برجان نامی چور سے بھی زیادہ چور نکلتا ہے

(۳۱) فقلت یا دهر سالمنی مسالمة — فاننی عمری ثم صاغانی

میں نے زمانہ سے کہہ دیا ہے کہ تو مجھ سے پوری مصالحت کرلے، ورنہ جان لے کہ میں عمرؓ بن خطاب کی اولاد سے ہوں اور صاغانی ہوں

(۳۲) فانصاع ینقاد اذعانا وسالمنی — ومد ضبعی دناغانی وصاغانی

اب وہ سچا منقاد ہوگیا ہے، اس نے مجھ سے مصالحت کرلی ہے، میرے بازو پھیلا دیے ہیں، مجھ سے قریب اور میری طرف ہمہ تن گوش ہوگیا ہے،

[1] یہ بھی ضرب المثل اسرق من برجان سے ماخوذ ہے، برجان نامی کوفہ میں ایک چور تھا جسے چوری کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی تو سزا کے موقعہ پر بھی چوری سے باز نہیں رہا، ملاحظہ ہو مجمع الامثال از مجمع کرمانی طبع طہران ۱۲۹۰ھ ص ۳۰۶

(۳۳) فصار شکوای شکرا والجوی فرحاً — والعتب عتبی وفادانی[1] وناجانی

اسلیے اب میرا شکوہ شکر سے اور غم خوشی سے بدل گیا اور ناراضگی رضامندی میں تبدیل ہوگئی اور اس نے مجھ سے سرگوشیاں کیں اور کہا میں تیرے قربان!

(۳۴) وذاک للصفح منی عن جنایته — والصفح[2] یجدی کثیرا ان جنی جان[3]

یہ تبدیلی اسلیے ہوئی کہ میں نے اس کے قصور سے درگذر کیا اور گنہگار کے گناہ سے درگزر کرنا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے،

یہاں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ ہندوستان میں سفارت کے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے صغانی کو کبھی ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا، وہ لغت کے امام اور فن حدیث کے ناقد تھے، اور یہی ان کا اصلی مذاق تھا، لیکن اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت سپرد کی جاتی تھی، اس کو انجام دے سکتا تھا، صغانی نے قیام ہندوستان کے زمانہ میں ہندوستان کے خلافتِ بغداد سے تعلقات ایسے مستحکم اور استوار کردیے تھے کہ سفارت کا تعلق ختم ہونے کے بعد بھی خلفاء کی عظمت بادشاہوں کے قلوب میں بدستور قائم رہی اور خلافت بغداد کی تباہی بھی ایک زمانہ تک اس کی یاد ان کے دل سے فراموش نہیں کراسکی اور شاہان ہند خلفاء کا نام اپنے سکوں پر برابر کھدواتے رہے اور ان کی نیابت کا دم بھرتے رہے،[4]

صغانی کے ہندوستان میں قیام کی مجموعی مدت

صغانی کی زندگی کے واقعات چونکہ تذکروں کی کتابوں میں مرتب نہیں ہیں اور جن ارباب تذکرہ نے کہیں کہیں سنہ کا تعین کیا ہے، ان میں سے بعض خود صغانی کی تصریح کے خلاف ہیں، صغانی کا بھی یہی دستور ہے کہ کہیں تو معمولی معمولی واقعات بھی

[1] فی الاصل فادانی [2] فی الاصل الکثیر [3] یہ پورا قصیدہ ابن ابی مخرمہ نے تاریخ ثغر عدن میں مجد الدین فیروز آبادی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن طبع لیڈن ۱۹۳۶ء ج ۲ ص ۵۸ [4] ملاحظہ ہو The Coinage and Metralugy of The Sultans of Dehli by H.N. Wright. Dehli. 1936

سنہ کو لکھ دیتے ہیں اور کہیں اہم مواقع پر بھی سنہ کا ذکر نہیں کرتے، چنانچہ عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں بنوائیں تو اس کا سنہ لکھ دیا، لیکن مجمع البحرین کی تالیف کا کام کس سنہ میں شروع کیا اور کب ختم ہوا، اس کا پوری کتاب میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں، اسی طرح مشارق الانوار اور العباب الزاخر کی تاریخ تحریر کا بھی کچھ پتہ نہیں، ایسی صورت میں واقعات کی ترتیب اور سنین کی تعیین میں جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، تاہم جہانتک واقعات کے بیان میں سنین کا سراغ مل سکا ہے انھیں نقل کر دیا گیا ہے، لیکن صغانی کا کل قلمی سرمایہ پیش نظر نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہیں اور بھی سنین کا ذکر آیا ہو، جن واقعات میں سنین کو نقل کیا گیا ہے وہ گذر چکے ہیں، اگر ان سنین کو سامنے رکھا جائے تو جمہور مورخین کے قول پر صغانی کے اس بیان الی شرقت وغربت بالهند والسند نیفا واربعین سنة کی صحت اسی وقت ممکن ہے جب ان کے بچپن کے ابتدائی دس سال لاہور ہی میں تسلیم کیے جائیں (جس کی تردید کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں) کیونکہ اس صورت میں صغانی کے ہندوستان اور سندھ میں قیام کی مجموعی مدت ۴۱ اور کسور کو شامل کرنے کے بعد ۴۳ سال پوری ہو جاتی ہے،

صغانی ۶۳۷ھ میں ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر بغداد چلے گئے، مورخ ذہبی تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں۔

قدم سنة اربع وعشرين ثم	صغانی ۶۲۴ھ میں بغداد آئے، پھر سفیر
اعيد اليها رسولاً عامئيذ فما	ہوکر اسی سال ہندوستان واپس چلے گئے
رجع الى بغداد سنة سبع وثلاثين[1]	اور ۶۳۷ھ تک بغداد واپس نہیں آئے۔

ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ۶۲۴ھ میں صغانی حجاز جاتے ہوئے

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام تذکرہ حسن بن محمد الصغانی، مخطوطہ رضا لائبریری رامپور۔

اور ۶۳۵ھ میں وہاں سے واپس آتے ہوئے بغداد نہیں گئے تھے، بلکہ حجاز سے سیدھے ہندوستان آگئے تھے، اس سے مولانا عبد الحی لکھنوی کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ انھیں خلیفۂ بغداد نے سلطانہ رضیہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا[1] جیسا کہ گذر چکا۔

کدرا میں ورود

صغانی ہندوستان سے جاتے ہوئے یمن کے ایک شہر کدرا میں بھی اترے تھے، چنانچہ مجمع البحرین میں فرماتے ہیں:

الكدراء بلدة[2] باليمن على وادى	کدرا یمن کا ایک شہر ہے جو وادی سہام
سهام واليها ينسب الاديم	کے پاس آباد ہے، کچا چمڑا اس کی طرف منسوب
قال الصغانى مولف هذا الكتاب	ہے، صغانی اس کتاب کا مولف کہتا ہے
وقد وردتها سنة سبع وثلاثين	میں ۶۳۷ھ میں ہندوستان سے بغداد
وستمائة منصرفى من الهند الى	(اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حفاظت میں
مدينة السلام حماها الله تعالى[3]	رکھے) جاتے وقت یہاں اترا تھا،

کدرا سے بغداد گئے تھے،

بغداد میں آمد اور رباط مرزبانیہ کی صدارت

صغانی نے ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں تصوف میں جو مقام حاصل کیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آپ بغداد پہنچے تو خلیفہ مستنصر باللہ نے آپ کو رباط المرزبانیۃ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کا صدر مقرر کیا، صغانی مجمع البحرین میں رقمطراز ہیں:

المرزبانية قرية على نهر عيسى	مرزبانیہ نہر عیسیٰ کے پاس اور محول کے بالائی
فوق المحول بنى بها الامام الناصر	حصہ میں ایک بستی ہے، الناصر لدین اللہ قدس اللہ روحہ

[1] نزہۃ الخواطر طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ج ۱ ص ۱۳۸ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۲۲۳ [3] مجمع البحرین (روٹوگراف کاپی) اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ کراچی، مادہ "کدر"

لدين الله قدس الله روحه	نے یہاں ایک مکان اور صوفیوں کے لیے
دار اور باطا لاهل التصوف	ایک سرائے بنوائی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی اس
تقبل الله منه وجعلني الامام	خدمت کو قبول فرمائے، خلیفہ مستنصر باللہ
المستنصر بالله انار الله برهانه	نے (اللہ تعالیٰ اس کی خلافت کو برقرار رکھے)
شيخ ذالك الرباط واوزعني شكر	مجھے اس سرائے اور خانقاہ کا صدر بنایا اور
نعمهم[1]	اللہ تعالیٰ مجھے ان نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرمائے

مرزبانیہ بغداد کی ایک بستی کا نام ہے جو اپنی سرسبزی اور شادابی میں مشہور تھی، خلیفۂ بغداد الناصر لدین اللہ چونکہ شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی المتوفی ۶۳۲ھ کا بڑا عقیدتمند تھا، اور ان کے فضل و کمال اور زہد و ورع سے اتنا متاثر تھا کہ مسلمان بادشاہوں کے دربار میں ان کو سفیر بنا کر بھیجتا تھا، اس لیے اس نے آپ کے رہنے کے لیے ایک نہایت کشادہ اور عالیشان مکان تعمیر کرایا، جس میں حمام بنوایا اور باغ لگوایا اور ایک سرائے اور خانقاہ تعمیر کر کے فقراء اور اہل اللہ کے لیے وقف کی، یہی وہ سرائے ہے جو رباط المرزبانیہ کے نام سے مشہور تھی، ابن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ شیخ شہاب الدین سہروردی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

بنى له الخليفة الناصر لدين الله	خلیفہ الناصر لدین اللہ نے آپ کے لیے ایک سرائے
رباطا بالمرزبانية على نهر عيسى	مرزبانیہ میں نہر عیسیٰ کے کنارے تعمیر کرائی تھی،
وبنى الى جنبه دارا واسعة	اور اس کے پہلو میں ایک نہایت کشادہ
وحماما وبستانا يسكنها باهله	مکان اور حمام بنوایا اور باغ لگوایا تھا،
ونفله الخليفة رسولا الى	یہاں آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے،

[1] ملاحظہ ہو مجمع البحرین ادہ منارب

عدة جهات وكان الملوك الذين	خلیفہ نے آپ کو مختلف شہروں میں سفیر بنا کر
يرد عليهم يبالغون فى اكرامه	بھیجا تھا، جن بادشاہوں کے دربار میں
وتعظيمه واحترامه اعتقادا	آپ جاتے تھے وہ حصول برکت کے لیے اور
فيه وتبركا[1]	ارادتمندی کی وجہ سے آپ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے،

شیخ شہاب الدین سہروردی شافعی المذہب عالم اور بڑے خداترس بزرگ تھے، اگرچہ علامہ سبکی بعض مسائل میں ان کے تفرد کی وجہ سے ان سے زیادہ خوش نہیں ہیں[2]، انھوں نے خلیفہ ناصر لدین اللہ سے وقف کے وقت غالباً یہ شرط کرائی تھی کہ اس کا صدر ہمیشہ شافعی المذہب عالم ہوگا، صغانی کو اس شرط کا علم نہ تھا، مگر آپ کئی برس تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے، ایک مدت کے بعد کسی ضرورت سے وقف نامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس وقت معلوم ہوا کہ واقف نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی المسلک عالم ہی ہوگا تو آپ فوراً صدارت سے دستبردار ہوگئے، مورخ ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فرتب شيخا برباط المرزبانية	پس آپ کو رباط مرزبانیہ کا صدر مقرر کیا گیا
فلم يزل الى اخر ايام المستنصر	اور آپ مستنصر باللہ کے آخری زمانہ تک
ثم نظر فى شرط الواقف فوجد	اس کے صدر رہے، اتفاق سے آپ نے
فيه ان يكون شافعيا فعزل	وقف نامہ پڑھا تو دیکھا کہ وقف کرنے والے نے
نفسه[3]	اس میں یہ شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی مسلک عالم ہوگا تو آپ فوراً اس منصب سے

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ، مکتبۃ العربیہ بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۴۷، [2] ملاحظہ ہو الطبقات الشافعیہ الکبری مطبعۃ الحسینیہ مصر ج ۵ ص ۴۴، [3] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۶۳

مستنصر باللہ کا انتقال جمادی الاخری ۶۴۰ھ کو ہوا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صغانی ۶۳۹ھ تک اس خدمت پر مامور رہے، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ الحوادث الجامعہ ہی میں "تتمۃ اخبار سنۃ ۶۴۳" کے ضمن میں یہ بھی موجود ہے کہ اسی سال (۶۴۳ میں) صغانی رباط المرزبانیہ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور شیخ الشیوخ علی بن النیار کو جو شافعی المذہب عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، صغانی کی جگہ صدر مقرر کیا گیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

فيها عزل رضي الدين الحسن بن محمد الصغاني عن مشيخة رباط المرزبانية لكونه حنفيا وشرط الواقف ان يكون شافعيا واضيف الرباط الى الشيخ علي بن النيار[1]

رضی الدین حسن بن محمد الصغانی اسی سال ۶۴۳ھ میں رباط مرزبانیہ کی صدارت سے مستعفی ہوئے، کیونکہ وہ حنفی تھے اور وقف کنندہ کی یہ شرط تھی کہ صدر شافعی مسلک کا عالم ہوگا، اس کے بعد رباط مرزبانیہ کی زمام شیخ علی ابن النیار کے ہاتھ میں دیدی گئی۔

مذکورۂ بالا بیان میں اس امر کی تصریح ہے کہ صغانی کے بعد رباط مرزبانیہ کا صدر شیخ علی ابن النیار کو بنایا گیا تھا، اس لیے یہی قول زیادہ صحیح ہے، لیکن مورخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ علی بن النیار کو شیخ الشیوخ ۶۴۲ھ میں بنایا گیا ہے یا ۶۴۳ھ میں، یہ اختلاف بھی دراصل اس امر پر مبنی ہے کہ وزیر نصیر الدین احمد بن الناقد کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا یا ۶۴۳ھ میں، کیونکہ اس کے

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۰۷، علی بن محمد بن الحسین نام، ابو المظفر کنیت، اور شمس الدین لقب تھا، بڑے جید عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، خلیفہ مستعصم باللہ کے مربی رہ چکے تھے، آپ ہی نے مستعصم کو قرآن مجید حفظ کرایا، تجوید کی تعلیم دی اور خوشنویسی سکھائی تھی، اس لیے مستعصم باللہ کے دور خلافت میں انھیں بڑا اعزاز حاصل رہا، ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، حالات کے لیے ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۰۷ اور البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۱۳ ص ۲۱۳

انتقال کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ نے قلمدان وزارت شیخ علی بن النیار کو سپرد کرنا چاہا تھا، مگر انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نے صوفیانہ لباس پہن لیا، اسے نہیں اتار سکتا، ان کا مکالمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فلما توفي الوزير بن الناقد خاطبه في تقليد الوزارة فابى وقال انى عاهدت الله ان لا اغير لبس المتصوفين ولا انزع عني ما تعودته فقيل له نحن نوافقك على ذلك بحيث تورخ الناس ان شخصا يختص بنا ندبناه الى الوزارة فابى ان يغير زيه فاجبناه الى ذلك فقال لان تورخ الناس ان شخصا متصوفا حسن فيه الظن وندب الى الوزارة فامتنع احسن من ذلك فحينئذ فوضت اليه مشيخة الشيوخ ببغداد... خوطب بشيخ الشيوخ.... ثم اضيف اليه مشيخة رباط المرزبانية[1]

جب وزیر بن الناقد نے وفات پائی تو خلیفہ نے انکو وزیر بنانا چاہا، انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ فقیرانہ لباس نہیں بدلوں گا اور جس کو میں نے اختیار کر لیا ہے اس کو نہیں چھوڑوں گا، ان سے کہا گیا ہم اس پر بھی آپ کی وزارت سے اتفاق کرتے ہیں تاکہ مورخین یہ لکھیں کہ ایک ایسے شخص کو جو ہم سے وابستہ تھا، ہم نے وزارت قبول کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنے فقیرانہ لباس کے بدلنے سے انکار کر دیا لیکن ہم نے اس شرط کو بھی قبول کر لیا، اس پر انھوں نے کہا کہ مورخین کا یہ لکھنا کہ ایک صوفی مشرب انسان کو جس کے ساتھ انھیں حسن ظن تھا وزارت کی دعوت دی گئی مگر اس نے انکار کیا بار وزارت اٹھانے سے بہتر ہے، اس وقت انھیں مشائخ بغداد کا صدر بنایا گیا اور شیخ الشیوخ

[1] الحوادث الجامعہ ص ۲۰۵

ان کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن العلقمی کو وزارت کا عہدہ ملا جس نے تاتاریوں سے مل کر خلافت اور عروس البلاد بغداد کا خاتمہ کر دیا، ابن کثیر نے ان ہی بزرگ کی وفات پر یہ فقرہ لکھا ذبح بغداد الخلافۃ کما تذبح الشاۃ (دار الخلافت بغداد میں انھیں اس طرح ذبح کر دیا گیا جس طرح بکری کو ذبح کیا جاتا ہے)

ابن الفوطی کا خیال بھی یہی ہے، وزیر نصیر الدین کا انتقال ۶۴۳ھ میں ہوا ہے، لیکن ابن الطقطقی نے الآداب السلطانیہ[1]، ذہبی نے دول الاسلام[2] اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں تصریح کی ہے کہ اس کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا تھا، ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سال علی بن النیار کو شیخ الشیوخ بنایا گیا،

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صغانی اس اہم خدمت پر کم وبیش پانچ برس مامور رہے اور مستنصر باللہ کے زمانۂ خلافت میں نہیں بلکہ مستعصم باللہ کے دورِ خلافت میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے،

(باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو الآداب السلطانیہ طبع مصر ص ۲۴۴ [2] دول الاسلام طبع اول دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۱۱۲ [3] البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۳ ص ۱۶۴

الفریڈ گل لیوم کے ورثۂ اسلام پر ایک نظر

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی وفارسی، اترپردیش،

۳ - مسئلہ کلام باری

کلام باری تعالیٰ کی بحث اسلامی فکر کا ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے جس کے اختلافاتِ تعبیر وتوجیہ کی وجہ سے بیشمار بندگان خدا کو قید ومحن کی شقتیں جھیلنا پڑیں اور دنیا کے منصف ترین اور فراخ مشرب حکمرانوں کے عہد حکومت پر تعصب وتشدد کا بدنما داغ لگ گیا، اس لیے ایک فاضل پروفیسر سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اس نازک مسئلہ کی مختلف تعبیرات میں اپنی ذمہ داری کو ملحوظ رکھیں گے لیکن بدقسمتی سے پروفیسر گل لیوم نے اس توقع کو پورا نہیں کیا۔

بہتر تو یہ ہوتا کہ فاضل پروفیسر مختلف فرقوں کے نقل وحکایت مذاہب ہی پر اکتفا فرماتے لیکن اگر نقل مذاہب مع دلائل ہی کرنا تھا تو پھر ہر فرقہ کے سلسلے میں اس کا التزام کرتے، ایک فرقہ کے موقف کو دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کرنا اور دوسرے فرقہ کے موقف کو بغیر دلیل وبرہان نقل کرنا نفسیاتی طور پر قارئین کے ذہن میں ضرور یہ غلط فہمی پیدا کرے گا کہ پہلے فرقہ کا موقف معقولیت پسندی پر موقوف ہے، اور دوسرے فرقہ کا عقیدہ محض لال بجھکڑپن کا نتیجہ ہے جس پر وہ محض بربنائے تعصب وجہالت مصر ہے، مثلاً پروفیسر موصوف نے معتزلہ کے مسلک کی توضیح میں لکھا ہے:

"معتزلہ کا کہنا تھا کہ اگر کلام اللہ کی صفت ہے تو لازمی طور پر اسے ازلی، قدیم اور تمام عالمون

سے پہلے موجود ہونا چاہیے ورنہ اگر اللہ نے زمان میں تکلم کیا تو اس سے اللہ کی ذات میں تغیر لازم آیا اور اللہ وہ ہوگیا جو وہ اس سے پہلے نہ تھا۔ اس طرح کا استحالہ اللہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، لہذا اگر کلام اللہ کی صفت ہے اور قرآن اس کلام کی دستاویز ہے تو اس مفروضہ کی بنا پر قرآن کو بھی اللہ کا کلام ہونے کی حیثیت سے قدیم ہونا چاہیے، لیکن یہ خلاف قیاس بات تھی، کیونکہ قرآن واضح طور پر عالم حادث کی چیز تھی، اسے نازل کیا گیا اور زمان و مکان میں اسے ضبط تحریر میں لایا گیا، چنانچہ اس کی بعض آیتیں واضح طور پر وقتی اور مقامی حوادث سے متعلق ہیں۔"[1]

اس کے برعکس اہل سنت کے موقف کے بارے میں صرف اتنا ہی فرمانے پر اکتفا کیا ہے:

اہل سنت یہ مانتے تھے کہ قرآن قدیم ہے، اور اس کے لفظی و ظاہری معنی ہی درست ہیں، اسکے ساتھ ساتھ وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیجانب منسوب بہت سی حدیثوں کو بھی تسلیم کرتے تھے۔"[2]

حالانکہ معتزلہ کا موقف اور اس موقف کی تائید میں جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ عموماً اہل سنت ہی کے کلامی لٹریچر سے ماخوذ ہیں، یعنی اہل سنت نے کمال فراخ دلی کے ساتھ اپنے مخالفین کے دلائل کو اپنی کتابوں میں قلمبند کیا ہے، اس کے بعد انھوں نے بڑی دقت نظری سے تجزیہ کر کے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے، نیز انھوں نے اپنے موقف کی ایک معقول توجیہ بھی پیش کی ہے، مگر فاضل پروفیسر کی تحریر میں ان باتوں کا ادنیٰ الزام بھی نہیں پایا جاتا، اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پروفیسر گل لیوم کے مقالہ میں اہل سنت کا مسلک بڑا ہی مضحکہ خیز بن گیا ہے، اور اعتزال کی مدلل توجیہ کے مقابلہ میں مسلک اہل سنت کے پیرو بچھ لال بجھکڑ ہی معلوم ہوتے ہیں،

ظاہر ہے یہ کوئی پسندیدہ صورت حال نہیں ہے، اس لیے مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ پیش کر دی جائے اور پھر ہر فریق نے جس انداز میں اسے سمجھا ہے اور جن وجوہ سے ایسا سمجھا ہے اسے بلا کم و کاست بیان کر دیا جائے،

---

[1] معارف بابت ماہ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۷

تاریخی پس منظر

تمام الہامی مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے یعنی صفت کلام سے متصف ہے، چنانچہ توریت میں باربار اللہ تعالیٰ کو "کہتے ہوئے" said اور "کلام کرتے ہوئے" spake بیان کیا گیا ہے، مثلاً

And The Lord God commanded The man, saying, of every Tree of The garden Thou mayest freely eat" (Gen. 2, 16)

And The Lord said Noah, come Thou and Thy house in The ark" (Gen. 7, 1)

And God said unto Abraham Thou shalt keep my convenant Therefore, Thou and Thy seed after Thee in Their generation. (Gen, 7, 1)

And The Lord spake unto Moses, Go unto Pharaoh and say unto him, Thus said The Lord, let my people go That They may serve me. (Exod. 8, 1)

بالخصوص سفر لویان کا تو ہر باب And The Lord spke unto Moses saying سے شروع ہوتا ہے،

اسی طرح انجیل میں متعدد مقامات پر خدا کے کلام کرنے اور "کہنے" کا ذکر آیا ہے، مثلاً

"For God commanded saying, Honour Thy father and mother." Mat. 15, 4

Have ye not read in the book of Moses, how in the bush God spake unto him, saying I am the God of Abraham." (Mark. 12.26)

انجیل نے صرف "کہنے" ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ" تک کی تصریح کی ہے،

Man shall not live by bread alone, but by every word that proceedeth out of the mouth of God." (Mat. 4,4)

اس "کلام خدا" کے تصور نے یہاں تک اہمیت حاصل کر لی تھی کہ انجیل یوحنا کا افتتاح ہی "کلمہ" کے ذکر سے ہوتا ہے:

"In the begining was the word, and the word was with God and the word was God." (John. 1,1)

رہا قرآن تو اس کا نام ہی "کلام اللہ شریف" ہے، حتیٰ کہ عام گفتگو میں علوم دینیہ کو "قال اللہ او قال الرسول" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی بنا پر قاضی بیضاوی نے "طوالع الانوار" میں لکھا ہے:

الثانی فی الکلام تواتر اجماع الانبیاء	دوسری بحث کلام باری کا مسئلہ: انبیاء علیہم السلام
علیہم السلام واتفاقھم علی انہ	کا اس امر پر اجماع و اتفاق ہو کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے،
سبحانہ وتعالیٰ متکلم[1]	اور یہ اجماع و اتفاق بر سبیل تواتر ثابت ہے،

اسی طرح قاضی عضد الدین الایجی نے "المواقف" میں لکھا ہے:

انہ تعالیٰ متکلم والدلیل علیہ	اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور اسکی دلیل انبیاء علیہم السلام
اجماع الانبیاء علیہم السلام تواترا	کا اجماع ہے، ان سے بر سبیل تواتر ثابت ہے کہ وہ
انھم کانوا یثبتون لہ الکلام[2]	اللہ تعالیٰ کے واسطے صفت کلام کو ثابت کرتے تھے۔

---

[1] طوالع الانوار ص ۷۰ [2] شرح المواقف ج ثامن ص ۹۱

بہر حال تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیمات کی بنیاد کلام باری کے عقیدے پر قائم تھی، ان میں زیادہ تر قدیم مذہب یہودیت ہے، لیکن بعد میں مشرک اقوام کے اختلاط و امتزاج اور روشن پرست جابرہ کے ہاتھوں میں اسیری و استعباد نے ان میں تشبیہ و تجسیم کی بدعات پیدا کر دیں، لہٰذا جب بطالمۂ مصر کے عہد میں یونانی فلسفہ سے ان کا سابقہ پڑا اور خود کو اس تشبیہ مفرطہ کی توجیہ سے قاصر پایا تو اس سے بچنے کے لیے تنزیہہ کے نام پر "تعطیل" کی جانب ان کا میلان بڑھنے لگا، اس انداز فکر کا سب سے مشہور نمائندہ فائلو (Philo) اسکندر روی ہے، جس نے "تجریدی توحید" اور "تنزیہہ نما تعطیل" کی دھن میں نو فلاطونیوں سے پہلے "صفات باری" کا انکار کیا، ولیم نیس لکھتا ہے:

"خدا کا تصور اس کے ہاں تمام محدودات سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی تصور اور کوئی نام خدا کی عظمت کو ظاہر نہیں کر سکتا، خدا تمام کمالات سے زیادہ اکمل اور تمام خوبیوں سے زیادہ خوب ہے، کسی نام اور صفت اور تصور کا اس پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔"[1]

اسی زمانہ میں مسیحیت مبعوث ہوئی مگر اسے بہت جلد پہلے یہودی تعصب کا اور پھر رومن ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنا پڑا، ان مصائب کو تو وہ اپنی بلندی کردار اور صبر و استقامت کی مدد سے برداشت کر گئی مگر بڑی مصیبت یہ آئی کہ بعض فلسفی فرقے اس میں گھس آئے اور مسیحیت کے ترجمان بننے کے مدعی ہو گئے، ان میں سب سے خطرناک "غنوصی فرقہ" (Gonostics) تھا، ان کی بدعتوں میں سے ایک بدعت یہ تھی کہ انھوں نے توریت کو الہ العٰلمین کے بجائے "الہ اونیٰ" کا کلام قرار دیا اور اس طرح بعد کی تنزیہہ نما تعطیل کے لیے راستہ ہموار کر دیا، پروفیسر تھلی ان کے بارے میں لکھتا ہے:

They thought that .... Judaism (is) a corrupt from of religion, the revelation of an inferior being (Thilly: Hist. of Philosophy. P.125)

---

[1] مختصر تاریخ فلسفۂ یونان ص ۲۶۸

یہودی اس وقت موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، بایں ہمہ دنیا میں جو ایک عام فکری بحران برپا تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اس فکری بحران کا گہوارہ "نو فلاطونیت" تھا جس کا اصل الاصول "تجریدی توحید" تھا، اور جس کے اندر بقول پروفیسر تھلی خدا کا تصور حسب ذیل تھا کہ:

He is so Transcendent That whatever we say of him merely limits him; hence we cannot attribute to him beauty or goodness or Thought or will for all such attributes are limitations and really imperfections. we cannot say what he is, but only what he is not."

(History of Philosophy P. 174)

اس تجریدی توحید کے نتیجہ میں پیدا شدہ "تنزیہ تا تعطیل" کے رجحانات یہود کے دینی حلقوں میں بھی پرورش پانے لگے، چنانچہ اس عہد کے (Apocalyptic) ادب میں "تنزیہ" و "ماورائیت" (Transcendentalism) کے رجحانات نمایاں ہیں، اسی طرح ترگوم میں قدیم تشبیہ مفرط کی تعدیل کی طرف ایک میلان پایا جاتا ہے[1]۔ بعد میں ان ہی رجحانات کو دوسرے دینی و علمی سرمایہ کے ساتھ لیکر یہودی تلاش امن میں باہر نکلے، ایک جماعت حجاز پہنچی جہاں مختلف مقامات میں اس نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں، ایک نوآبادی مدینہ منورہ میں تھی جہاں انھوں نے مشرکین و منافقین کے ساتھ اشاعت اسلام میں روڑے اٹکائے اور مسلمانوں کو ہر طرح کی اذیتیں پہنچائیں، ان ہی مسلم آزاروں میں ایک شخص لبید بن اعصم تھا جس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا، لبید بن اعصم "خلق توریت" کا قائل تھا،

---

[1] New commentary on Holy scripture, Part III, P. 10

اس کا بھانجا اور شاگرد طالوت تھا، جس نے مورخین کی تصریح کے مطابق سب سے پہلے "خلق توریت" کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی اور اس طرح نئے زندقہ کو پھیلایا، (تفصیل آگے آرہی ہے)

فتح خیبر اور جلاوطنی کے بعد یہودی عراق اور شام کی طرف چلے گئے۔ طالوت سے "خلق توریت" کا عقیدہ ابان بن سمعان نے لیا اور ابان بن سمعان سے "تعطیل" اور "نفی صفات باری" کی تعلیم جعد بن درہم حرانی نے حاصل کی، حران ہمیشہ سے صابئیت کا گہوارہ رہا ہے، اور یونانی فلسفہ کے عہد زوال میں فلاسفہ کا ملجا و ماویٰ تھا، چنانچہ وہ اپنی یونانیت پسندی کی وجہ سے "مدینۃ الیونانیین" (Helleno-poles) کہلاتا تھا، اسی حران کا باشندہ جعد بن درہم تھا، لہذا ظاہر ہے کہ اس کے رجحانات کیا ہوں گے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے "عقیدۂ حمویہ" میں لکھا ہے:

ثم اصل هذه المقالة انما هو ماخوذ	پھر اس قول (خلق قرآن اور نفی صفات) کی اصل
عن تلامذة اليهود والمشركين و	یہود و مشرکین اور گمراہ صابئین کے شاگردوں سے
ضلال الصائبين .... اول ماظهرت	ماخوذ ہے.... سب سے پہلے یہ قول جعد بن درہم سے
هذه المقالة من جعد بن درهم	(مسلمانوں میں) ظاہر ہوا، اسے جہم بن صفوان نے
واخذها عنه الجهم بن صفوان	سیکھ کر اسے ظاہر کیا، لہذا عقیدۂ جہمیہ اسی کی جانب
واظهرها فنسب مقالة الجهمية	منسوب ہوتا ہے، جعد بن درہم نے اس عقیدہ کو
اليه والجعد اخذ مقالته عن ابان	ابان بن سمعان سے سیکھا تھا، اور ابان بن سمعان
بن سمعان واخذها ابان من طالوت	نے طالوت سے حاصل کیا تھا جو لبید بن عاصم کا بھانجا
ابن اخت لبيد بن اعصم واخذها	تھا، طالوت نے اسے لبید بن اعصم یہودی جادوگر
طالوت من لبيد بن اعصم اليهودی	سے اخذ کیا تھا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو
الساحر الذی سحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کیا تھا اور جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ جعد حران کا باشندہ تھا۔

وکان الجعد ھذا فیما قیل من اھل	اور وہاں صابئین اور فلاسفہ کی ایک بڑی
حران وکان فیھم خلق کثیر من الصابئة	تعداد موجود تھی ..... اور ان لوگوں کا مذہب
والفلاسفة ..... ومذھبھم فی	اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ ہے کہ سوائے سلبی یا
الرب انه لیس له الا صفات سلبیة	اضافی صفات کے یا ایسی صفات کے جو سلبی و اضافی
او اضافیة او مرکبة منھما ..... فیکون	صفات سے مرکب ہوں اس کی کوئی صفت
الجعد قد اخذھا عن الصابئة الفلاسفة[۱]	نہیں ہے ..... پس جعد نے اس عقیدہ کو صابی

جعد بن درہم نے ابان بن سمعان اور اس کے اساتذہ کی "بدعت خلق توریت" کو قرآن پر جاری کیا اور "خلق قرآن" کی بدعت کا آغاز کیا، چنانچہ ابن تیمیہ نے حافظ ابو القاسم لالکائی کی "شرح اصول السنہ" سے نقل کیا ہے،

ولا خلاف بین الامة ان اول من	اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ
قال القرآن مخلوق الجعد بن درھم	جس نے سب سے پہلے قرآن کو مخلوق کہا وہ جعد بن درہم تھا،

جعد بن درہم کچھ تو اپنی امن سوز کارروائیوں اور کچھ اس الحاد و زندقہ کی وجہ سے حکمراں طبقہ میں مبغوض تھا، چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے عراق کے والی خالد بن عبداللہ القسری کو لکھا کہ جعد بن درہم کو گرفتار کرکے قتل کردو، خالد بن عبداللہ نے اس حکم کی تعمیل کی، حافظ ابن تیمیہ نے "الفرقان بین الحق والباطل" میں لکھا ہے،

وقد قیل ان اول من عرف انه اظھر	اور کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جو شخص مسلمانوں میں عقیدۂ
فی الاسلام التعطیل الذی تضمنه	تعطیل کے اظہار کے لیے مشہور ہوا جو فرعون کے
قول فرعون ھو الجعد بن درھم فضحیٰ	قول پر مشتمل ہے، وہ جعد بن درہم ہے، پس اسے
به خالد بن عبداللہ القسری وقال	خالد بن عبداللہ القسری نے ذبح کیا، اس نے اس سے
ایھا الناس ضحوا تقبل اللہ ضحایاکم	پہلے لوگوں سے کہا لوگو! تم جاکر اپنی اپنی قربانی ذبح کرو

[۱] عقیدہ حمویہ مشمولہ رسائل الکبریٰ لابن تیمیہ ج اول ص ۴۲۴ - ۴۲۵

انی مضح بالجعد بن درھم انه	اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے اور
زعم ان اللہ لم یتخذ ابراھیم	میں جعد بن درہم کی قربانی کروں گا کیونکہ اس کا
خلیله ولم یکلم موسیٰ تکلیما	گمان ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام
تعالی اللہ عما یقول الجعد علوا	کو اپنا دوست بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام
کبیرا۔ ثم نزل فذبحه[۱]	کیا، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں بلند ہے جو

جعد بن درہم سے "خلق قرآن" اور "تعطیل" کے عقائد کو جہم بن صفوان نے اخذ کیا، اس نے نفی صفات باری پر اس قدر زور دیا کہ یہ مذہبِ فکر اسی کے نام سے موسوم ہوکر "تجہم" یا "جہمیت" کہلانے لگا، عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے،

وامتنع من وصف اللہ تعالیٰ بانه	اور جہم اللہ تعالیٰ کی اس طور پر توصیف سے منع کرتا تھا
شیٔ او حی او عالم او مرید وقال	کہ وہ شی ہے یا حی ہے یا عالم ہے یا مرید (ارادہ کرنے والا)
لا اصفه بوصف یجوز اطلاقه	ہے اور وہ کہتا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی صفت
علی غیرہ ..... وقال بحدوث	سے متصف نہیں کرتا جس کا اطلاق غیر اللہ پر
کلام اللہ تعالیٰ کما قالته القدریة[۲]	..... اور وہ فرقہ قدریہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے کلام

جہم کے "تجہم" سے معتزلہ متاثر ہوئے، اگرچہ یہ اثر ان کے طبقۂ اولیٰ میں زیادہ نمایاں نہیں ہے، شہرستانی کا خیال ہے کہ واصل بن عطا، الغزال بھی صفاتِ باری کا منکر تھا، مگر یہ خیال اس کے یہاں زیادہ مکمل اور واضح شکل میں نہیں پایا جاتا،

القاعدة الاولیٰ بنفی صفات الباری	فرقۂ واصلیہ کا دوسرا اصول صفات باری تعالیٰ
من العلم والقدرة والارادة	مثلاً علم، قدرت، ارادہ اور حیات کی نفی ہے

[۱] الفرقان بین الحق والباطل مشمولہ رسائل الکبریٰ لابن تیمیہ ج اول ص ۱۳۷، [۲] الفرق بین الفرق ص ۱۹۹

والحیاۃ - وکانت ھذہ المقالۃ	اور یہ عقیدہ ابتدا میں غیر مکمل اور
فی بدوھا غیر نضیجۃ[1]	خام شکل میں تھا۔

لیکن امام احمد بن حنبل نے اپنے رسالہ "الرد علی الزنادقہ والجہمیہ" میں تصریح کی ہے کہ جہم کے "مذہب نفی صفات" کو معتزلہ میں سے واصل کے دست راست عمرو بن عبید اور اس کے پیروؤں نے اختیار کیا، یہ بھی ممکن ہے کہ عبارتِ ذیل میں "ابو حنیفہ" "ابو حذیفہ" کی تحریف ہو جو واصل کی کنیت تھی، اس صورت میں واصل کا جہم سے متاثر ہونا ثابت ہو جاتا ہے،

واتبعہ علی قولہ رجال من اصحاب	اور جہم کے اس عقیدے کی پیروی ابو حنیفہ (ابو حذیفہ)
ابی حنیفۃ واصحاب عمرو بن عبید بالبصرۃ"[2]	اور عمرو بن عبید کے متبعین نے بصرہ میں کی،

مگر "خلق قرآن" کا عقیدہ نہ تو واصل کے یہاں اپنی مکمل شکل میں ملتا ہے اور نہ ابو موسیٰ المزدار سے پہلے متاخرین معتزلہ کے یہاں، البتہ جہم کا خاص شاگرد جس کا نام عقیدۂ خلقِ قرآن سے خصوصی طور پر وابستہ ہے وہ بشر بن غیاث المریسی ہے (تفصیل آگے آرہی ہے) بشر معتزلی نہیں تھا، مگر عقیدہ "خلق قرآن" کا بڑا سرگرم مبلغ تھا اور اس کی اسی بدعت کی وجہ سے امام ابو یوسفؒ نے اس سے مفارقت اختیار کرلی تھی، امام عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے:

(بشر المریسی) وکان فی الفقہ علی رای	بشر المریسی فقہیات میں امام ابو یوسف کا تبع تھا
ابی یوسف القاضی غیر انہ لما اظہر	لیکن جب اس نے اپنے عقیدۂ خلق قرآن کا اظہار کیا
قولہ بخلق القرآن ھجرہ ابو یوسف[3]	تو امام ابو یوسف نے اس سے مفارقت اختیار کرلی،

بشر عہد مامونی کا زبردست متکلم تھا، جب علمائے اہل سنت نے متکلمین معتزلہ کے ساتھ مناظرہ سے انکار کیا تو امام عبد العزیز مکی صاحب کتاب الحیدہ مامون کے دربار میں پہنچے اور مجمع عام میں بشر بن غیاث المریسی

[1] الملل والنحل للشہرستانی ج اول ص ۳۰ [2] مذہب الاسلامیین عند المسلمین ص ۱۲۶ [3] الفرق بین الفرق ص ۱۹۲

کو مسئلہ خلق قرآن کے باب میں عقلی وشرعی دلائل سے شکست دی (اس کی تفصیل آگے آئے گی)

مامون الرشید کا عہد حکومت ہر طرح سے تاریخ اسلام کا "عصر زریں" کہلانے کا مستحق ہے، روشن خیالی، فراخ مشربی اور علم وحکمت کی سرپرستی کی اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہیں ملتی، مگر اس خورشید درخشاں پر "فتنۂ خلق قرآن" اور "امتحان ائمہ" کا بدنما داغ لگا ہوا ہے، وہ طبعاً عقلیت کا پرستار تھا، اور علوم الاوائل کا دلدادہ، اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اس کا یہ میلان بھی بڑھتا گیا، ابن شاکر کتبی نے لکھا ہے:

ولما کبر عنی بالفلسفۃ وعلوم الاوائل	مامون جب بڑا ہوا تو اسے یونانی علوم کا شوق ہوا اور فلسفہ
ومھر فیھا فجرہ ذلک الی القول بخلق القرآن[1]	میں مہارت حاصل کی، اسی وجہ سے وہ خلق قرآن کا قائل ہو گیا،

چنانچہ ربیع الاول ۲۱۲ھ میں اس نے معتزلہ دربار کے اثر سے جو مہدی کے زمانہ سے دربار خلافت پر چھائے ہوئے تھے "خلق قرآن" کا اظہار کیا مگر رائے عامہ عرصہ سے متکلمین کی سرگرمیوں سے بیزار تھی، لہٰذا اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور اس تحریک کو ملتوی کرنا پڑا، سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے:

وفی سنۃ اثنتی عشرۃ اظھر المامون	۲۱۲ھ میں مامون نے عقیدہ خلق قرآن کا اعلان
القول بخلق القرآن ... فاشمأزت	کیا ... اس سے رائے عامہ بھڑک اٹھی اور قریب تھا کہ
النفوس وکاد البلاد یفتتن ولم یلتئم	شہروں میں فتنہ وفساد پھیل جائے، لہٰذا اس میں کامیابی
لہ من ذلک فکف عنہ الی سنۃ ثمان عشرۃ[2]	نہیں ہوئی، اس لیے وہ ۲۱۸ھ تک اس سے رکا رہا،

۲۱۸ھ میں مامون رومیوں سے جنگ کرنے گیا، میدان جنگ سے اس نے وہ مشہور خط بغداد میں اپنے نائب کو بھیجا جس میں باضابطہ عقیدۂ خلق قرآن کی بالجبر اشاعت پر زور دیا تھا، اس طویل خط کو طبری نے نقل کیا ہے، اس حکم کے بموجب اس عقیدے کی جبریہ اشاعت کرائی گئی اور اکابر علماء مثلاً محمد ابن سعد کاتب واقدی اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو مامون کے پاس بھیجا گیا، جہاں انھیں اس "امتحان" سے دوچار ہونا پڑا،

[1] فوات الوفیات ج ۱ ص ۲۳۹ [2] تاریخ الخلفاء ص ۲۱۰

اس کے بعد کی تفاصیل غیر ضروری ہیں، مگر مامون کے آخری خط میں مشاہیر علماء کی ذاتی کمزوریوں پر بھی حملہ کیا گیا ہے، مامون کی عالی ظرفی سے تو یہ بعید تھا کہ وہ ان افراد رعایا کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہا ہو، البتہ درباری علماء، ائمۂ اہل سنت سے خار کھائے بیٹھے تھے، اور غالباً ان ہی کے ایماء سے یہ خط لکھا گیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "من طلب الدین بالکلام تزندق" کا انتقام لیا جا رہا تھا، اور "حکمی فی اہل الکلام ان یضربوا بالجرید والنعال" تو ایک دھمکی بنکر ہی رہ گیا تھا، مگر معتزلۂ دربار نے اس دھمکی کا بدلہ عملی جلد ضرب حتی کہ قتل سے لیا، بیشمار بندگان خدا پابجولاں دربار میں "امتحان" کے لیے لائے جاتے، امام احمد بن حنبل کے اس شدت سے تازیانے لگائے گئے کہ وہ بیہوش ہو گئے، نصر بن احمد خزاعی کو صرف اسی جرم میں قتل کرکے ان کی لاش بابک خرمی کے برابر صلیب دی گئی،

بہر حال یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ ۲۱۲ھ سے ۲۳۲ھ تک قلمروئے خلافت میں جو کچھ ہوتا رہا وہ صرف ایک "اصولی نظریاتی" جنگ نہ تھی بلکہ بہت کچھ تنگ نظر علماء کے ذاتی تحاسد و تباغض کا نتیجہ تھا، اگر دیانتداری کے ساتھ محض احقاق حق ہی اس تحریک کا مقصد ہوتا تو غالباً جب دربار میں امام عبد العزیز مکی نے بشر بن غیاث المریسی کو خلیفہ کے روبرو مناظرے میں عقلی و شرعی دلائل سے لاجواب کر دیا تھا، تو مامون کو اس سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا، یا کم از کم اس تشدد کو روا نہ رکھنا تھا، مگر متکلمین دربار خلفا کے کان بھرتے رہتے تھے، اور وہ اس سے متاثر ہو کر یہ ظالمانہ اعلانات نکالتے رہتے تھے،

فتنۂ خلق قرآن کی تاریخ میں امام عبد العزیز مکی اور بشر بن غیاث المریسی کے مناظرے کی خاص اہمیت ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احقاق حق کے علاوہ سخن پروری بھی اس تحریک میں کارفرما تھی، اس حیثیت سے اس کی تفصیل ضروری تھی مگر خوف طوالت مانع ہے تاہم دو چار کلمے اس سلسلے میں کہنا از بس ضروری ہے،

پہلے تو "کتاب الحیدہ" جس میں اس مناظرے کی تفاصیل مرقوم ہیں، اس کے قابل اعتماد ہونے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں تین شک کیے جا سکتے ہیں،

ا۔ امام عبد العزیز مکی کوئی فرضی شخصیت ہے،

ب۔ کتاب الحیدہ کسی بعد کے غیر معتزلی کی تصنیف ہے جس نے اسے امام عبد العزیز مکی کی طرف منسوب کر دیا ہے،

ج۔ امام عبد العزیز مکی نے اس کتاب میں اظہار واقعہ کے بجائے شیخی طرازی سے کام لیا ہے،

پہلے دو شکوک کا ازالہ تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں مصنف اور تصنیف دونوں کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

عبد العزیز بن یحیی المکی: فی طبقة	عبد العزیز بن یحیی المکی: حارث المحاسبی کے
الحارث وهو عبد العزیز بن یحیی بن	ہمعصر ہیں، ان کا نام عبد العزیز بن یحیی بن
عبد الملک بن مسلم ابن میمون	عبد الملک بن مسلم بن میمون الکنانی تھا، وہ
الکنانی - وکان متکلما مقدما و	مشہور متکلم اور زاہد و عابد تھے، علم کلام اور
زاهدا وعابدا وله فی الکلام	زہد میں کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان کی
والزهد کتب - وتوفی وله من الکتب:	کتابوں میں کتاب الحیدہ مشہور ہے،
کتاب الحیدة فیما جری بینه وبین	جس میں ان کے اور بشر المریسی کے
بشر المریسی[1]	مناظرے کا ذکر ہے۔

تیسرے شک کا ازالہ کتاب کا اسلوب بیان کرتا ہے: غیر متعلق واقعات، بدوی اکھڑپن اور آداب دربار سے ناشناسائی صدق بیان کی شاہد ہے،

کتاب کے مستند اور قابل اعتماد ثابت ہو جانے کے بعد اس کے بیانات حکمراں طبقہ کی سخن پروری اور علمائے دربار کے بغض و حسد کو بے نقاب کرتے ہیں اس کی تفصیل تو موجب تطویل ہوگی، چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں،

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۶۱

(۱) مناظرے کے آغاز میں یہ اصول طے ہوا تھا کہ ہر اختلافی امر میں کتاب و سنت کا فیصلہ آخری اور انقطاعی ہوگا، چنانچہ امام عبد العزیز نے یہ شرط رکھی تھی:

اذا اختلفنا فی شیٔ من الفروع رددناہ الی کتاب اللہ عزوجل فان وجدناہ فیہ والا الی سنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فان وجدناہ فیہا والا ضربناہ فی الحائط[1]

اگر ہم کسی فروعی مسئلے میں اختلاف کریں تو قرآن مجید سے رجوع کرینگے، اگر وہاں اس کا حل ملجائے تو خیر ورنہ حدیث شریف سے رجوع کرینگے، اگر وہاں اسکا جواب ملجائے تو خیر ورنہ اس مسئلہ کو دیوار سے دے مارینگے

اور مامون نے اس شرط کو منظور کرکے یقین دلادیا تھا،

قال المامون فافعلا ہذا واصلاہ بینکما واتفقا علیہ وانا الشاہد علیکما[2]

مامون نے کہا اچھا اس بات کو دونوں اصول بنالو اور اس پر اتفاق کرلو اور میں تم دونوں کا گواہ ہوں،

بلکہ آخر میں تو امام عبد العزیز سے یہاں تک کہہ دیا تھا.

قال فناظرہ بالتلاوۃ ونص التنزیل[3]

مامون نے امام عبد العزیز سے کہا تم بشر سے صریح آیات قرآنی کے استشہاد کے ساتھ مناظرہ کرو۔

لیکن آخر میں جب بشر بن غیاث المریسی کا قافیہ تنگ ہونے لگا تو اس نے اس اصول سے پیٹھ پھیرلی اور مامون سے صاف کہدیا:

قال بشر یا امیر المومنین عندی اشیاء کثیرۃ الا انہ یقول بنص التنزیل وانا اقول بالنظر والقیاس[4]

بشر نے کہا یا امیر المومنین میرے پاس بہت سے دلائل ہیں مگر عبد العزیز صریح آیات قرآنی سے استشہاد کیا کرتے ہیں بحث کرتے ہیں اور میں نظر و قیاس (عقلی دلائل) کیا کرتا ہوں

(۲) علمائے دربار اپنے اور مخالفوں کی طرح امام عبد العزیز کے قتل کے بھی خواہاں تھے، لیکن دوران مناظرہ

[1] کتاب الحیدہ ص ۱۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳ [4] ص ۵۰

میں جب بشر نے خلق قرآن کے ثبوت میں آیۂ کریمہ "انا جعلناہ قرآنا عربیا" پڑھی تو امام عبد العزیز نے پوچھا کہ کیا قرآن میں جہاں بھی جعل کا لفظ آیا ہے وہ "خلق" ہی کے معنی میں ہے؟ بشر نے کہا "جی ہاں پورے قرآن میں"۔

اس پر امام عبد العزیز نے کہا

اخبرنی عمن قال بعض ولد آدم خلق القرآن من دون اللہ امومن ہو ام کافر قال بشر کافر حلال الدم[1]

مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ جو یہ کہتا ہو کہ قرآن کو اللہ نے نہیں بلکہ بنی آدم میں سے کسی نے پیدا کیا ہو، ایسا شخص مومن ہے یا کافر، بشر نے جواب دیا وہ کافر ہے جس کا

اسی طرح انھوں نے متعدد سوالوں کے جواب میں بشر سے "کافر حلال الدم" کہلوالیا، اسکے بعد اس پر حجتیں قائم کرنا شروع کیں، مثلاً

قال سبحانہ علی المقتسمین الذین جعلوا القرآن عضین فزعم بشر ان المقتسمین خلقوا القرآن[2]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا "بانٹنے والوں پر جنھوں نے کلام الٰہی کو تکے بوٹی کرلیا"۔ پس بشر نے گمان کیا کہ ان مقتسمین (بانٹنے والوں) نے قرآن کو پیدا کیا ہے،

اور اس سے زیادہ یہ کہ

قال اللہ عزوجل ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم فزعم بشر ان معنی ولا تجعلوا اللہ ولا تخلقوا اللہ لا معنی لہ عندہ غیر ذلک ثم قال من قال ہذا فہو کافر حلال الدم[3]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو" پس بشر نے گمان کیا کہ ولا تجعلوا اللہ کے معنی ہیں "مت پیدا کرو اللہ کو" اسکے علاوہ اسکے نزدیک دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے، پھر کہتا ہے جو ایسا کہے وہ کافر ہے جس کا خون بہانا جائز ہے۔

لیکن مامون پر ان حجتوں کے قیام کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس نے اعتراف تو کیا مگر رجوع نہیں کیا۔

[1] کتاب الحیدہ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] ایضاً ص ۳۷

فاقبل علی المامون وقال حسبك یاعبد العزیز فقد اقر بشر علی نفسه بالکفر واحل الدم واشهدنی علی نفسه بذلك وقد صدقت فیما قلته ولکنه قال ما قال وهو لا یعقل ولا یعلم ما علیه فیه[1]

پس مامون میری طرف متوجہ ہو کر بولا عبد العزیز بس کرو کیونکہ بشر نے اپنے کافر ہونے اور جائز القتل ہونے کا اقرار کر لیا اور اس باب میں مجھے اپنے پر گواہ بنایا، جو کچھ تم نے کہا سچ کہا لیکن بشر نے جو کچھ کہا ایسی حالت میں کہا کہ نہ اسے اتنی عقل تھی اور نہ اس کا علم تھا کہ ایسا کہنے سے اس پر کیا اعتراض وارد ہونگے،

یہ واقعہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ خود مامون کو احقاق حق سے زیادہ سخن پروری منظور تھی،

(۳) آخر میں بشر نے خود تجویز پیش کی تھی کہ اگر عبد العزیز کتاب و سنت کے بجائے عقلی طور پر مجھ سے مناظرہ کرے اور میں اسے قائل نہ کر دوں تو میرا خون حلال ہے:

فلیدع مناظرتی بنص التنزیل و لیناظرنی بغیره فان لم یدع قوله ویرجع عنه ویقول بقولی بخلق القرآن الساعة فدمی له حلال[2]

مجھ سے آیات قرآنی کے ذریعے مناظرہ کرنا چھوڑ دے اور اسکے بجائے دوسرے (عقلی) دلائل سے مناظرہ کرے تو اگر وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے اور میرا مذہب اختیار نہ کر لے اور قرآن کے مخلوق ہونے کا فوراً اقرار نہ کرے تو میرا خون اس کے لیے حلال ہے،

امام عبد العزیز نے عقلی دلائل سے بھی بشر کو لاجواب کر دیا، لیکن ایفائے مشروط کے بجائے مامون نے احسنت و مرحبا کا نعرہ بلند کر کے اور دس ہزار درم دیکر سخن پروری کی جھینپ مٹائی۔

فقال المامون احسنت یا عبد العزیز ثم امر لی بعشرة الآف درهم[3]

مامون نے کہا اے عبد العزیز شاباش! پھر مجھے دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا،

(۴) اور کتاب کا خاتمہ جن الفاظ پر ہوا ہے ان سے تو یہ حقیقت صاف ہو جاتی ہے کہ جابرۂ عہد کی

[1] کتاب الحیدہ ص ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰ [3] ایضاً ص ۵۵

سطوت سے اہل سنت سکوت عن الحق پر مجبور تھے، اسی لیے امام عبد العزیز نے اس کی پوری تفصیل نہیں دی،

ولم یتهیأ لی ان اشرح هذا کله مما تخوفت علی نفسی مما قد یلحقنی بعد هذا المجلس وما جری بسبب الاوراق علی الناس[1]

اور میرے لیے اس واقعہ کو شرح و بسط سے بیان کرنا ممکن نہ ہو سکا کیونکہ مجھے اپنی جان کا خوف تھا کہ اس مجلس مناظرہ کے بعد مجھ پر کیا آفت آئے اور ان اوراق کے سبب لوگوں پر کیا افتاد پڑے،

یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مامون اور اس کے درباری علما محض خود رائی کی خاطر اس فتنہ کو فروغ دے رہے تھے، ورنہ نہ عقل اس کی مؤید تھی نہ شریعت،

مامون کی وفات پر معتصم اس کا جانشین ہوا اور ایک جانشین کی حیثیت سے اس نے اپنے پیشرو کی پالیسی کو جاری رکھا، سیوطی نے لکھا ہے:

فسلك ما کان المامون علیه وختم به عمره من امتحان الناس بخلق القرآن .... وقتل علیه خلقا من العلماء وضرب الامام احمد بن حنبل وکان ضربه سنة عشرین.....[2]

معتصم بھی مامون کی روش پر چلا اور لوگوں کو خلق قرآن کے عقیدہ پر مجبور کرنے میں اپنی عمر ختم کر دی، ..... اور اس جرم میں بہت سے علماء کو قتل کیا اور امام احمد بن حنبل کو بلوایا اور یہ سزا انھیں ۲۲۰ھ میں دی گئی۔

خلفاء اس قول کی سخافت اور اس فتنہ کی شناعت سے اچھی طرح واقف تھے مگر دربار پر معتزلہ چھائے ہوئے تھے، اور انھوں نے اس مسئلہ کو حق و باطل کے بجائے دربار خلافت کے وقار اور کمزوری کا مسئلہ بنا دیا تھا، معتصم باللہ اس "محنة" کو ختم کر دینا چاہتا تھا، مگر احمد بن ابی داؤد جو بشر بن غیاث المریسی کا شاگرد اور صحیح معنوں میں جانشین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ معتصم کے مزاج میں بھی دخیل تھا، اسے اس کے جاری

[1] کتاب الحیدہ ص ۵۵ [2] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۹

رکھنے پر برانگیختہ کرتا رہا، حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے:

وظهر للخليفة المعتصم امرهم	خلیفہ معتصم باللہ پر اس مسلک کی کمزوری واضح
وعزم على رفع المحنة حتى الح عليه	ہوگئی تھی اور اس نے اس "محنۃ" کو موقوف کرنے کا
ابن ابی داؤد يشير عليه انك ان لم	تہیہ کرلیا تھا، مگر احمد بن ابی داؤد نے اصرار کیا
تضربه انكسر ناموس الخلافة	اور کہا کہ اگر آپ احمد بن حنبل کو کوڑے نہ لگوائیں گے
تضربه فعظمت الشناعة من العامة	تو خلافت کا وقار ختم ہوجائیگا، اسلیے انکے کوڑے
والخاصة فاطلقوه[1]	لگوائے، مگر عوام وخواص سبھی نے اس بات کی مذمت کی

مجبوراً انھیں چھوڑنا پڑا

معتصم نے ۲۲۷ھ میں وفات پائی، مگر عموریہ کی فتح سے اس نے جو نیکنامی حاصل کی تھی امام احمد ابن حنبل کی جلد وضرب سے وہ ماند ہو کر رہ گئی، اس کا جانشین واثق ہوا، وہ اس سے زیادہ اکھڑ تھا لیکن معتزلہ دربار بالخصوص قاضی احمد بن ابی داؤد کے اثر ورسوخ سے اس نے بھی با دل ناخواستہ اس ظلم وتشدد کو جاری رکھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

كان احمد بن ابی داؤد قد	احمد بن ابی داؤد واثق کے مزاج پر غالب تھا
استولى على الواثق وحمله على	اور اسی نے اسے اس "محنت" [لوگون کو بالجبر
التشدد فی المحنة ودعا الناس	قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ رکھنے] کے بارے میں
الى القول بخلق القرآن	تشدد ومبالغہ برتنے پر آمادہ کیا اور لوگوں کو
	خلق قرآن کے عقیدے کی طرف دعوت دی،

چنانچہ ۲۳۱ھ میں اس نے بصرہ کے ائمہ وموذنین کو "محنۃ" کے شکنجے میں کسنے کا حکم دیا، سیوطی نے لکھا ہے:

وفی سنة احدی وثلثين وماىٔة	۲۳۱ھ میں واثق کا حکم نامہ بصرہ کے گورنر کے پاس

۱؎ منہاج السنۃ ج ۱ ص ۲۵۶، ۲۵۷

كتابه الى امير البصرة يامره ان يمتحن	پہنچا جس میں اسے حکم دیا گیا تھا کہ ائمہ وموذنین
الائمة والموذنين بخلق القرآن	سے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرائے، اس باب
وكان قد تبع اباه فی ذلك[1]	میں واثق نے اپنے باپ کی پیروی کی تھی،

اس تعصب وتشدد کا انتہائی شرمناک پہلو یہ تھا کہ اسی سال جب رومیوں سے مسلمان قیدیوں کی رہائی کا معاملہ طے ہوا تو احمد بن ابی داؤد نے حکم دیا کہ جو قیدی قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کریں انھیں تو چھڑایا جائے اور جو انکار کریں انھیں رومیوں کی قید ہی میں چھوڑ دیا جائے، لیکن اب اس ظلم وستم کے دن ختم ہو چکے تھے، ہاں آخری شہادت درکار تھی، اور یہ مقدس فریضہ شہید نصر بن احمد خزاعی نے انجام دیا، انھوں نے قرآن کو مخلوق کہنے سے انکار کیا اور واثق نے فقہاے معتزلہ کے فتوٰی سے انھیں اپنے ہاتھ سے شہید کیا، سر بدن سے الگ کیا، پھر سر تو بغداد میں نصب کیا گیا اور لاش سامرا میں بابک خرمی کے برابر صلیب دی گئی،

واثق نے یہ خون ناحق اپنے ہی ہاتھ سے بہایا مگر اس کا ضمیر اسے اس ظلم وتشدد پر ضرور ملامت کرتا رہا ہوگا، اور عام خیال یہی ہے کہ اس نے موت سے پہلے اس ظالمانہ "محنۃ" سے رجوع کر لیا، سیوطی نے لکھا ہے:

وكان قد تبع اباه فی ذلك ثم رجع	اور واثق نے اس محنہ کے باب میں اپنے باپ کے
فی آخر امره[2]	نقش قدم پر چلا تھا مگر آخر میں اس نے اس سے رجوع کر لیا

اسی طرح خطیب بغدادی نے لکھا ہے

ويقال انه رجع عنه قبل موته	اور کہا جاتا ہے کہ واثق نے مرنے سے پہلے "محنۃ" سے رجوع کر لیا تھا

یہ کس طرح ہوا؟ کہتے ہیں کہ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن محمد الازدی جو امام ابو داؤد سجستانیؒ اور

۱؎ تاریخ الخلفاء ص ۲۳۲ ۲؎ ایضاً

امام نسائی کے اساتذہ میں سے ہیں، پابجولاں واثق کے پاس "محنۃ" کے لیے لائے گئے، ابن ابی داؤد بھی وہاں موجود تھا، ابوعبدالرحمن نے پوچھا "بتاؤ جس چیز کی طرف تم دعوت دیتے ہو اسے جناب نبی کریمؐ جانتے تھے اور جانتے ہوئے لوگوں کو اس کی دعوت نہیں دی یا جانتے ہی نہیں تھے، ابن ابی داؤد نے جواب دیا "نہیں بلکہ جانتے تھے"، ابوعبدالرحمن نے فرمایا کہ رسول کے لیے تو گنجایش تھی کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت نہ دیں اور تمھارے لیے گنجایش نہیں ہے، اس برمحل اعتراض سے سب لاجواب ہوگئے[1] اور واثق باوجود کوشش کے ہنسی ضبط نہ کرسکا، اس لیے جلد ہی اندر چلا گیا جہاں وہ باربار کہتا تھا۔

وسع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسکت عنہ ولم یسعنا[2]	جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تو گنجایش تھی کہ وہ اس سے سکوت برتیں مگر ہمارے لیے گنجایش نہیں ہے!

غرض واثق کا ضمیر اسے ملامت کرتا تھا مگر جھوٹا وقار اس کے اعلان سے مانع تھا، اگلے سال اس کی وفات پر اس کا بھائی متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا، اس نے زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیا، وہ جانتا تھا کہ نہ صرف رائے عامہ ہی اس "محنۃ" کے خلاف ہے بلکہ عقل و شرع کوئی اس کی تائید نہیں کرتا، لہٰذا خلیفہ ہوتے ہی اس نے اس مسئلہ میں مناظرہ بازی کی ممانعت کردی:

وکان المتوکل لما ولی نھی عن الجدال فی القرآن وغیرہ وکتب الی الآفاق بذلک[3]	جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے بارے میں مناظرہ کی ممانعت کردی اور ساری قلمرو میں [illegible]

اسکے ساتھ اس نے احیاء سنت کیلئے محدثین کو بلاکر انکی ہر طرح ہمت افزائی کی، سیوطی نے لکھا ہے:

المتوکل علی اللہ ... فاظھر المیل الی السنۃ ونصر اھلھا ورفع المحنۃ وکتب بذلک الی الآفاق وذلک فی سنۃ اربع وثلثین	متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا ..... اسکا سنت کیجانب میلان تھا، اور اس نے اہل سنت کی مدد کی، "محنۃ" کو موقوف کردیا اور قلمرو خلافت میں اس کا اعلان کردیا،

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۳۳ [2] ایضاً [3] کامل لابن اثیر ج سابع ص ۲۱

واستقدم المحدثین الی سامراء واجزل عطایاھم واکرمھم وامرھم ان یحدثوا باحادیث الصفات والرؤیۃ[1]	یہ ۲۳۴ھ کا واقعہ ہے، اس کے علاوہ اس نے محدثین کو سامرا میں بلاکر گراں بہا عطیات دیے اور تعظیم و تکریم کی، انھیں حکم دیا کہ صفات باری اور رویت باری کے متعلق احادیث کی روایت کریں،

بہرحال تجہم و اعتزال کے دن پورے ہوچکے تھے، معتزلہ کا اثر دربار سے زائل ہونا شروع ہوا ان کا زعیم ابن ابی داؤد معرض عتاب میں آیا، اس لیے نہیں کہ اس کے اشارے پر علمائے اہل سنت کو "محنۃ" کے شکنجے میں کسا گیا تھا، یا بیگناہ نصر بن احمد خزاعی کا خون بہایا گیا تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنے دامن کو ان انسانی کمزوریوں سے جن کا الزام معتزلہ دربار دوسرے علما پر لگاتے تھے، زیادہ گھناؤنی بدکاریوں، رشوت ستانی، خیانت اور تغلب بیجا سے ملوث کر رکھا تھا، ابن الاثیر ۲۳۷ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

وفیھا غضب المتوکل علی احمد بن ابی داؤد[2] وقبض ضیاعہ واملاکہ وحبس ابنہ محمدا ابا الولید	اور اس سال متوکل احمد بن ابی داؤد سے ناراض ہوا، اسکی جائداد ضبط کرلی گئی اور اولاد قید کردی گئی،

اسی عالم میں قاضی احمد بن ابی داؤد نے ۲۴۰ھ میں وفات پائی اور اسکے ساتھ معتزلی تعصب و تشدد کا دور ختم ہوا، یہ پس منظر تھا جس میں "کلام باری" کے متعلق مختلف اسلامی فرقوں کے مذاہب متعین ہوئے، ان مذاہب کی تفصیل سے پیشتر اس تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لینا مناسب ہوگا،

۱- تمام الہامی مذاہب میں "کلام باری" کے تصور کو اساسی حیثیت حاصل ہے،

۲- تجریدی توحید (Abstract Monotheism) سراسر باہر کا اثر ہے کسی الہامی مذہب کی داخلی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے،

۳- تنزیہ نما تعطیل "اور کلام باری کی دور از کار توجیہات سراسر غیر اسلامی ہیں،

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۳۶ [2] کامل لابن اثیر ج سابع ص ۱۹

ٹونک کے دو قدیم کتب خانے

از جناب مولوی سید منظور الحسن صاحب برکاتی استاد دار العلوم خلیلیہ ٹونک

ٹونک میں کتب خانوں کے باضابطہ قیام کی ابتدا دوسرے فرمانروا نواب وزیر الدولہ کے عہد سے ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ اصل موضوع پر سلسلۂ سخن شروع کیا جائے، ماحول اور پس منظر کو سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ٹونک کے قیام اور اس کی سیاسی و بنیادی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈال دیجائے، نیز اجمالاً ان سیاسی اسباب کا بھی تذکرہ کر دیا جائے کہ جن کی بنا پر اس ریاست کی تاسیس عمل میں آئی،

یہ ریاست جو آج راجستان کے ایک ضلع کی حیثیت رکھتی ہے، راجستان کی ریاستوں میں واحد مسلم ریاست تھی، اور آج سے پورے ایک سو بیالیس سال پہلے ۱۸۱۷ء میں عالم وجود میں آئی تھی، اس کے بانی نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں بہادر سنبھل کے ایک منچلے اور بہادر افغان تھے جنھوں نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو جنگی خدمات میں نمایاں مدد دی تھی۔ اور مہارانا ہلکر کی معاونت میں انگریزوں سے جنگ کرکے بہت سے علاقے فتح کر لیے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی بنا پر عام طور پر طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، صوبے اور ریاستیں خود مختار ہو چکی تھیں، اور انگریزوں نے ملک میں ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے تھے۔ اس وقت مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور نواب امیر خاں بہادر نے باہمی معاہدہ کرکے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور آزادی کی جنگ کی اس ملک میں ابتدا کی اور باہمی اتحاد سے متحدہ قومیت کا سنگ بنیاد رکھا،

۱۸۰۵ء میں جب مہاراجہ ہلکر نے انگریزوں سے صلح کر لی اور ان کے ورغلانے سے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تو امیر الدولہ بہادر نے مجبور ہو کر اس چھوٹی سی ریاست پر انگریزوں سے مصالحت کر لی اور ۱۸۱۷ء میں بتوسط لالہ نرنجن لال مختار، عہد نامہ پر دستخط کر دیے۔

نواب امیر خاں قیام ریاست کے بعد سترہ سال تک حکمراں رہے، ۱۸۳۴ء میں انکا انتقال ہوا، ان کا پورا عہد حکومت ریاست کی بنیاد مستحکم کرنے میں ختم ہوا، انھیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ ریاست میں باقاعدہ عدالتی یا تعلیمی نظام قائم کرتے، ان کے زمانہ میں ریاست کا نظام فوجی طاقت پر قائم تھا،

نواب امیر خاں کے بعد نواب وزیر محمد خاں "وزیر الدولہ امیر الملک" مسند ریاست پر جلوہ فگن ہوئے، عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد انھوں نے ریاست کی تنظیم جدید کی طرف توجہ مبذول کی، اور پٹھانوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈھال دیا، آپنے اپنی دوربین نگاہوں سے جب ریاست کے حالات کا جائزہ لیا تو سب سے بڑی کمی یہ محسوس کی کہ اس نئی ریاست میں اہل سیف تو بہت زیادہ جمع ہو گئے ہیں، لیکن اہل قلم اور اہل علم کی بڑی کمی ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے آپنے تہیہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو اصحاب کمال کو ریاست میں جمع کیا جائے۔

وہ خود صاحب علم تھے، اور اہل علم و ارباب فن کی قدر و منزلت کرتے تھے، انکی قدر دانی اور فیض رسانی کی اتنی شہرت ہوئی کہ اطراف ہند سے ارباب فضل و کمال کھنچ کھنچکر ٹونک آنے لگے، ان میں بہتیرے خود سے آئے اور بہتوں کو وزیر الدولہ نے بلایا، اس طرح بڑے بڑے علما، اور فضلا نے وزیری اقبال کے سایہ میں پناہ لی، مصنف تاریخ ٹونک مولوی سید اصغر علی ابرد کا بیان ہے کہ

> ان کی شاہانہ فیاضیوں سے ان کا آستانۂ فیض ہر ایک علم و فن کے اہل کمال کا قبلۂ حاجات اور مرکز عقیدت بنا ہوا تھا، شہنشاہ اکبر کے نورتن ہی نہیں بلکہ سیکڑوں یگانۂ روزگار اور باکمال ہستیاں دربار وزیری میں جمع ہو گئی تھیں، اور ان کی بارگاہِ سلیمان جاہ مرجع ارباب

فضل وکمال ومجمع دانایان روزگار وپختہ کاران باوقار تھی۔" (ص ۳۲)

وزیر الدولہ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے، آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جن میں "وصایاے وزیری" فارسی میں علم اخلاق کی بہترین کتاب ہے،

"اس کتاب میں مختلف مناسبتوں سے ۶۵ مقام پر نواب صاحب نے عاشقانہ وارفتگی اور مریدانہ عقیدت مندی کے ساتھ حضرت سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) اور آپ کے رفقا کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے حالات وکمالات درج کیے ہیں، جن میں اکثر آپ کے چشم دید ہیں۔"

(سیرت احمد شہید مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۹)

وزیر الدولہ کو علمی، ادبی، اسلوبی اور تاریخی کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا، آپ کے عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں زر کثیر صرف کرکے جمع کی گئی تھیں، ان کے لیے ایک خاص عمارت قلعۂ معلی میں تعمیر کرائی گئی تھی، اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں مطلا اور مذہب اور نقاشی اور طلاکاری کا بہترین نمونہ تھیں، اور اپنے مخطوطات ونوادرات کے لحاظ سے ہندوستان کے کتب خانوں میں خاص امتیاز رکھتا تھا، دور دور اس کی شہرت تھی، اس کی فہرست برٹش میوزیم کے لیے سرہنری ایلیٹ کی خواہش پر فرمانرواے ٹونک نے بھیجی تھی، جس کا تذکرہ جناب محمد عباس خاں شروانی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے بھی اپنے ایک مضمون "تاریخ التواریخ" میں کیا ہے،

"آیئے سب سے اول ریاست ٹونک کے کتب خانوں کی سیر کریں، یہاں دو کتب خانہ ہیں، ایک تو پبلک لائبریری ہے، مگر جامعیت یا نوعیت کے لحاظ سے یہ کوئی بڑا اور مشہور ذخیرہ نہیں ہے، دوسرا مشہور کتاب خانہ ہندوستان میں اور ایک زمانہ میں ہندوستان سے باہر بھی معروف، ہز ہائی نس نواب صاحب کا کتب خانہ ہے، جو قلعہ کے اندر ہے، اس میں چند نادر الوجود نسخے ہیں، ایک زمانہ میں اس کتاب خانہ کی کتابوں کی فہرست فرمانرواے ریاست نے

سرہنری ایلیٹ کو دی تھی اور یہ اب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔"

(اخبار نیا ہندوستان علی گڈھ، یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء)

قلعۂ معلی کے اس کتب خانہ سے نواب صاحب کے متوسل علما، اور ندما ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے، ہر شخص آسانی سے اور بلا اجازت نہیں دیکھ سکتا تھا،

عہد وزیری سے لیکر موجودہ ہز ہائی نس نواب محمد اسمٰعیل علی خاں بہادر کے عہد تک یہ نادر الوجود کتب خانہ اسی شان واہتمام سے قلعۂ معلی ہی میں تھا، لیکن ریاست کے راجستان میں شامل ہونے کے بعد موجودہ نواب صاحب نے اس کو قلعۂ معلی سے "ہز ہائی نس پیلس نذر باغ" میں منتقل فرمادیا اور اس سے استفادہ کی عام اجازت بھی دیدی،

اس کتب خانہ کو جب وہ قلعۂ معلی کی ایک شاندار عمارت میں سجا ہوا تھا، میں نے بھی دیکھا تھا، کتابیں فن وار الماریوں میں بڑے سلیقے سے جمی ہوئی تھیں، کتابوں کی کئی فہرستیں تھیں، جو جدید طرز پر ریاست کے چوتھے فرمانروا نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے عہد میں جناب شیخ محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں تیار کرائی گئی تھیں، ان میں کتاب کے نام اور فن کے ساتھ صاحب تصنیف کا بھی مختصر حال درج تھا، کتابوں پر خوبصورت اور پھولدار کپڑے کی چولیاں چڑھی ہوئی تھیں، جو مختلف رنگوں کی تھیں، ہر فن کے لیے ایک قسم کی چھینٹ یا جامہ دار مخصوص تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خوشنما گلزار ہے، جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول کھلے ہوئے ہیں، الماریوں پر رنگین اور خوبصورت پردے آویزاں تھے، اور پٹیوں پر جو پوشش تھی وہ بھی دیدہ زیب اور خوشنما چھینٹ کی تھی، کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے قبل ہی ان کے ظاہری حسن سے جو خوشگوار اثر قلب ونظر پر پڑا اس سے ایک خاص سرور حاصل ہوا، بہت دیر تک تو مجھے اس دلفریب نظارہ ہی سے فرصت نہ ملی، اس کے بعد جب کتابوں کا مطالعہ کیا تو ہر فن میں بیسیوں نوادر نظر آئے، مثلاً

فن وعظ میں ایک کتاب بزبان فارسی "وصایای بادشاہانِ جغتائیہ" نظر پڑی، کتاب کا ہر صفحہ طلائی کام سے آراستہ تھا، بہترین نقش و نگار کے ساتھ خط بھی نہایت پاکیزہ تھا، شاہان جغتائیہ میں سے جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ، شہاب الدین محمد شاہجہاں، اور اورنگ زیب عالمگیر کی تصاویر بھی کتاب کی زینت تھیں،

ایک اور کتاب چہار گلشن فارسی نظر سے گذری، کتاب کے شروع میں دو مہریں ثبت تھیں، ایک مربع تھی جس پر وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ اور دوسری بیضوی تھی، جس پر امیر و وزیر محمد علی ۱۲۸۱ھ کندہ تھا، کتاب کا سنہ تصنیف ۱۱۹۵ھ درج تھا، فہرست اس طرح تھی: گلشن اول در احوال بادشاہ ہندوستان، گلشن دوم در احوال صوبجات جنوبستان، گلشن سوم در مسافت و منازل از شاہجہاں آباد دہلی، گلشن چہارم در ذکر سلاسل فقرا و درویشان ہند۔

ایک چوبی اور منقش صندوق میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا قلمی قرآن مجید تھا،

غرض اس قسم کے سینکڑوں نوادر و مخطوطات نظر سے گذرے اور کئی گھنٹے اس علمی گلزار میں گزارے جس سے روح و دماغ کو تازگی و بالیدگی حاصل ہوئی،

عہد وزیری میں مولوی عبد الکریم خاں صاحب ٹونکی، اس کتب خانہ کے ناظم تھے، موجودہ نواب صاحب کے عہد میں مولوی صاحبزادہ احمد خاں نازش اور نواب صاحب کے مشیر سخن مولانا سید عبد القادر صاحب خنداں یکے بعد دیگرے اس کتب خانہ کے ناظم رہے،

۱۹۵۴ء میں یہ کتب خانہ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیمات کی تحریک پر مرکزی حکومت نے "انڈین نیشنل لائبریری" کے لیے نواب صاحب سے خرید لیا اور یہ انمول و بے بہا ذخیرہ ٹونک سے دہلی منتقل ہو گیا،

یمین الدولہ نواب محمد علی خاں کا کتب خانہ

نواب وزیر الدولہ کے بعد دوسرا نمبر تیسرے فرمانروا نواب محمد علی خاں بہادر کے کتب خانہ کا ہے، جو ایک عرصہ تک "کتب خانہ سعیدیہ" کے نام سے مشہور رہا، اور اب "ڈسٹرک لائبریری ٹونک" کے نام سے موسوم ہے،

یہ کتب خانہ بھی اپنے بیش بہا نوادر اور مخطوطات کے اعتبار سے بڑا قیمتی اور بے نظیر ہے، اس نے ریاست کے بڑے اہم دور دیکھے ہیں، اور یہ خود بھی اپنی نشو و نما میں بڑی بڑی دشوار گذار منزلوں سے گزرا ہے، مختلف آزمایشوں سے دوچار ہوا ہے، اس کے عروج و زوال کی کہانی بڑی درد انگیز اور عبرت خیز ہے، اس نے شہر یاری بھی کی ہے، اور مسافرت و غربت کی کٹھن منزلیں بھی طے کی ہیں، یہ شاندار محلوں اور عالیشان ایوانوں میں نہایت عزت و احترام سے سجایا بھی گیا ہے اور بے بسی و کس مپرسی کی حالت میں ویران اور شکستہ عمارتوں میں بھی پڑا رہا ہے۔

اس کتب خانہ کی داغ بیل جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یمین الدولہ نواب محمد علیخاں بہادر نے ڈالی تھی، نواب محمد علی خاں، وزیری علماء و فضلا کے سایہ میں پلے بڑھے تھے، حکومت و ریاست کے ساتھ دینداری اور علم و فضل بھی آپ کو ورثہ میں ملا تھا، علوم دینیہ میں یمین الدولہ کو کامل دستگاہ حاصل تھی، اور ان کا شمار اُس زمانہ کے جید علماء میں ہوتا تھا، زمانہ ولیعہدی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے، اس لیے مسند نشین ریاست ہوتے ہی آپ نے تصنیف و تالیف کا کام سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا، اور ارباب علم و فن کو خاص طور پر اس اہم کام کے لیے متعین فرمایا، چنانچہ آپ کے مختصر دور حکومت میں بہت سی اعلیٰ تصانیف وجود میں آئیں اور زیور طبع سے بھی آراستہ ہوئیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم تصنیف "قرۃ العیون" ہے، جس میں علوم عربیہ اور تاریخ اسلامیہ کے دقیق مسائل بڑی تحقیق و تنقید کے ساتھ بیان کیے ہیں، یہ کتاب پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے،

قیام ریاست سے اب تک دفاتر سرکاری کی زبان فارسی تھی، آپ نے اس کے بجائے اردو زبان

کو حکومت کے سنگھاسن پر بٹھایا اور خاص فرمان کے ذریعہ ریاست کی سرکاری زبان اردو کو قرار دیا۔

نواب محمد علی خاں اپنے دادا نواب امیر الدولہ کی طرح جوشیلے تھے، اختیار ملتے ہی دہلی کے غدر کے بعد انگریزوں سے اس کا انتقام لینے کی فکر میں رہتے تھے لیکن ان کے پاس سرفروش آدمیوں کی کمی تھی، خود ان کے قریبی لوگ انگریزوں کے وفادار تھے، اور ان کے عزائم سے انگریزوں کو خبردار کرتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین سال آٹھ ماہ کی حکومت کے بعد ہی لاوہ کے ٹھاکروں کے قتل کے الزام میں سرغنہ قرار دیکر معزول کر کے بنارس بھیجدیا گیا ؎

گرا جو دامن گلچیں میں گل نے رو کے کہا ۔۔۔ کہ میری جان کا دشمن تھا رنگ و بو میرا

بنارس پہنچکر نواب محمد علی خاں نے اپنی تمام توجہ تصنیفی و تالیفی کاموں کی جانب پھیر دی، ٹونک سے رخصت ہوتے وقت وہ اپنے تمام ندماء اور علماء کو اپنے ساتھ بنارس لے گئے، وہاں آپ نے "الاصلاح" کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا،

جب آپ بنارس پہنچے تو چیدہ چیدہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ آپ کے ساتھ تھا جس میں آئے دن نئی نئی اور نادر و نایاب کتابیں اضافہ فرماتے رہے، اس طرح مختلف علوم و فنون کی نفیس اور نادر قلمی کتابوں کا ایک بیش بہا خزانہ آپکے کتب خانہ میں جمع ہوگیا،

بنارس میں کتب خانہ کی نگرانی جن حضرات کے سپرد تھی، ان میں محمد امین خلف فتح اللہ خاں ملیح آبادی، منشی ظہور اللہ خاں، منشی احمد زماں خاں نصیر آبادی، منشی سید محمد صدیق اور مولوی عبد الکریم خاں صاحب ٹونکی کے اسماء قابل تذکرہ ہیں، مولوی عبد الکریم صاحب کتب خانہ کی نظامت کے عہدہ پر فائز تھے، اور اس سے قبل وزیر الدولہ بہادر کے کتب خانہ قلعہ معلی کی بھی نگرانی فرما چکے تھے،

منشی محمد صدیق کی نگرانی میں کتابوں کی فہرستیں تیار ہوتی تھیں، اور سلیقے سے فن وار ترتیب

دیا جاتا تھا، ایک جماعت نادر اور کمیاب کتابوں کی نقلیں کرنے کے لیے متعین تھی،

نواب محمد علی خاں معزولی کے بعد تیس سال تک حیات رہے، ۱۸۹۸ء میں بنارس ہی میں انتقال کیا، تاریخ ٹونک میں مولوی اصغر علی آبرو لکھتے ہیں:

حضور مغفور (محمد علی خاں) کا تیس سال تک بنارس میں قیام رہا، اس قیام کی مدت میں بڑے بڑے کام رفاہ عام و انتفاع عوام جاری فرمائے، ایک عالیشان مسجد ساٹھ ہزار روپیہ کی لاگت سے بنوائی، مدرسہ علوم اسلامیہ کی بنا ڈالی، مدرسین لایق و فایق معقول تنخواہ کے ملازم رکھے، طلبہ کے وظائف مقرر فرمائے، شبانہ روز علما کی صحبت، اہل علم سے رغبت، کتب دینیہ کا شوق، قال اللہ، قال الرسول کا ذوق پیرامون خاطر عاطر تھا، اکثر عمدہ عمدہ کتب دینیہ مفید عام تصنیف فرمائیں اور ہزارہا روپیہ کے صرفہ سے چھپوائیں، اور بغرض حصول ثواب عقبیٰ غربا و طلبہ اور ہر ایک اہل طلب کو مفت تقسیم کیں۔" (ص ۳۲۹)

یمین الدولہ کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ بنارس سے ٹونک منتقل ہوا، اور بطور ترکہ صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کو ملا، صاحبزادہ صاحب یمین الدولہ کے تیسرے فرزند تھے، اور ایک عرصہ سے اپنے پدر بزرگوار کے سایہ میں بنارس ہی میں اقامت گزیں رہے تھے، یہ بھی علم دوست اور علم و فن کے قدر دان تھے، آپ نے اپنی عالیشان کوٹھی جو بازار علی گنج میں ہے، کتب خانہ کے لیے مخصوص کر دی تھی، اور مطالعہ کرنے والوں کے لیے خاص انتظام کیا تھا، جو عملہ بنارس میں کتب خانہ پر مقرر تھا، صاحبزادہ عبد الرحیم خاں اس کو بھی کتب خانہ کے ساتھ ٹونک لے آئے تھے اور ان کی تنخواہیں اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے،

صاحبزادہ صاحب نے بھی اپنے ذاتی شوق سے اس کتب خانہ میں کافی کتابوں کا اضافہ کیا، دیوان مولوی شمس الدین صاحب (جن کا محلہ کالی پلٹن میں گھیر مشہور ہے) عربی فارسی کے جید عالم تھے،

اور ٹونک کے عمائد وارکین سلطنت میں شمار ہوتے تھے، ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، جو ایک مستقل کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس کتب خانہ میں بھی مختلف فنون کی کتابیں تھیں، جن میں نوادر بھی تھے، ان کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ بھی یمین الدولہ کے کتب خانہ میں شامل کر دیا گیا،

بعض واقف کار حضرات کا بیان ہے کہ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں نے دیوان جی کا کتب خانہ خرید لیا تھا، اور بعض لوگ اس کی تردید کرتے ہیں، بہرحال شمولیت کی نوعیت کچھ بھی ہو، یہ امر واقعہ ہے کہ وہ کتب خانہ بھی اس میں شامل ہوا،

ایک اور کتب خانہ جو مولوی عبدالحق صاحب ٹونکی کا ذاتی تھا، ان کی وفات کے بعد اسی کتب خانہ میں وقف کر دیا گیا، ۱۹۴۸ء میں ٹونک کے راجستان میں شمولیت کے بعد جب یہاں کا محکمۂ شریعت ختم کیا گیا تو اس کا کتب خانہ بھی جس میں زیادہ تر فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں تھیں، حکومت راجستان نے اسی کتب خانہ میں منتقل کر دیا، اسی طرح یہ کتب خانہ، کئی کتب خانوں کا جامع ہو گیا، صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کی وفات ۱۹۲۱ء میں ہوئی، ان کی وفات کے بعد یہ کتب خانہ جو اس وقت "عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ" کے نام سے مشہور تھا، ان کے فرزندوں صاحبزادہ عبدالسمیع خاں اور صاحبزادہ مولوی عبدالمنعم خاں کی ملک میں منتقل ہو گیا اور صاحبزادہ عبدالسمیع خاں اس کی نگرانی و سرپرستی فرماتے رہے،

کچھ عرصہ بعد جب صاحبزادہ عبدالسمیع خاں نے رحلت کی تو صاحبزادہ عبدالمنعم خاں اور صاحبزادہ عبدالسمیع خاں کے فرزند عبدالبصیر خاں کے درمیان کتب خانہ کے سلسلہ میں نزاع ہو گئی، رفع نزاع کے لیے چوتھے فرمانروا نواب ابراہیم خاں بہادر نے اس کی نگرانی اور انتظام صاحبزادہ محمد اسحاق خاں بہادر ممبر کونسل ریاست کے سپرد کر دیا، جو صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کے بھائی بھی تھے، صاحبزادہ اسحاق خاں بہادر نے اس نزاع کو دور کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ کتب خانہ کو

چچا بھتیجوں میں تقسیم کر دیا جائے، لیکن صاحبزادہ عبدالمنعم خاں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کتب خانہ پر بدستور ممبر صاحب کونسل کا انتظام بحال رہا، یہاں تک کہ نواب ابراہیم خاں بہادر خلد آشیاں ہو گئے، اور ۱۹۳۰ء میں ان کے فرزند نواب سعادت علی خاں مسند ریاست پر متمکن ہوئے،

نواب سعادت علی خاں بہادر نے اپنے جد امجد نواب محمد علی خاں کی صحبت میں بنارس میں اکتساب علوم کیا تھا، والی ریاست ہونے کے بعد بھی ان کا یہ علمی ذوق باقی رہا اور قیام بنارس ہی سے اس کتب خانہ کے حصول کی فکر میں تھے،

اسے حسن اتفاق کہیے کہ ایک مرتبہ نواب صاحب کو کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت پیش آئی، اس کتاب کے کتب خانہ سے آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، اس دشواری کو محسوس کر کے نواب صاحب نے اس کتب خانہ کو "کوٹھی صاحبزادہ عبدالرحیم خاں" سے باغ عرب صاحب کی کوٹھی میں منتقل فرما دیا، اور اس کی نگرانی توشہ خانہ خاص کے سپرد فرما دی اور مہتمم توشہ خانہ منشی مرزا محمد بیگ صاحب مرحوم کو اس کتب خانہ کا ناظم مقرر فرما دیا، اور کتب خانہ کے عملہ کی تنخواہیں توشہ خانہ سرکاری کے بجٹ سے دیے جانے کا حکم صادر فرمایا،

اس وقت اس کتب خانہ میں منشی رحمت اللہ خاں اور منشی فخر زماں خاں بحیثیت کارکن کام کر رہے تھے، تقریباً آٹھ سال یہ کتب خانہ عرب صاحب کی کوٹھی میں رہا، لیکن یہ عمارت شہر سے دور پڑتی تھی، مطالعہ کرنے والوں کو جانے آنے میں دقت ہوتی تھی، اور وہ جگہ کچھ ویران سی تھی، اس لیے نواب سعادت علی خاں مرحوم کے حکم سے ٹونک کی عالیشان کوٹھی "ناتمام" میں منتقل ہو گیا، یہ کوٹھی ہز ہائی نس پیلس نذر باغ سے متصل تال کٹورہ پر نواب ابراہیم علی خاں بہادر کی تعمیر کردہ ہے، نواب ابراہیم علی خاں مرحوم ٹونک میں تعمیر کے باب میں اپنے وقت کے شاہجہاں تھے، ٹونک کی اکثر قابل دید عمارتیں ان ہی کی تعمیر کردہ ہیں،

۱۹۴۶ء میں نواب سعادت علی خاں نے اس کتب خانہ کو "کتب خانہ سعیدیہ" کے نام سے ریاست کو دیدیا، اور اس کا تعلق محکمۂ تعلیمات ریاست سے کردیا، محکمۂ تعلیمات نے اس کی ترقی و توسیع کے لیے اپنے بجٹ میں ایک خاص رقم منظور کی، اور صاحبزادہ عبدالعظیم صاحب بی اے ایل ایل بی کو لائبریرین کے عہدہ پر فائز کیا، اور اس کے عملہ میں بھی اضافہ کیا،

صاحبزادہ عبدالعظیم خاں صاحب نے اپنے زمانہ میں کتب خانہ کی جدید ترتیب کا کام شروع کیا اور اپنے معاون کے طور پر مولانا محمد عمران خاں کی خدمات حاصل کیں اور بحیثیت نائب ناظم انکا تقرر فرمایا،

مولوی محمد عمران خاں ایک جوان صالح اور عالم دین ہیں، آپ نے اپنے ذاتی شوق اور علمی ذوق کی بنا پر بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نایاب اور انمول علمی ذخیرہ کو جو امتداد زمانہ سے "کس مپرسی" کے عالم میں تھا، بڑی حسن و خوبی سے آراستہ کیا، کئی فہرستیں تیار کیں، کتابوں پر از سر نو نمبر اندازی کی، اور ان کی فن وار جدید تقسیم و تنظیم کی، ہر فن کی علٰحدہ علٰحدہ فہرستیں مرتب کیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کے علٰحدہ سیکشن قائم کیے، قلمی نوادر و مخطوطات کی خود وضاحتی فہرستیں ترتیب دیں، جن میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مصنف کا نام، اس کے مختصر حالات، کتاب کا موضوع، سنہ کتابت اور اس کی اہمیت، غرضکہ جملہ ضروری معلومات درج کیں،

۱۹۵۶ء میں جب "نا تمام کوٹھی" میں "گورنمنٹ انٹر کالج" قائم کردیا گیا تو پھر اس غریب کتب خانہ کو محل بدر ہونا پڑا، اور وہاں سے صاحبزادہ محمد حیات خاں کی حویلی (واقع علی گنج) میں منتقل کیا گیا، لیکن یہاں بھی اس کو قرار و قیام نصیب نہ ہوا اور ابھی ایک سال اور کچھ ماہ ہی گذارے تھے کہ جولائی ۱۹۵۸ء میں یہاں سے بھی رخت سفر باندھنا پڑا اور وہ بازار علی گنج کی نو تعمیر "اسماعیل بلڈنگ" میں پہنچ گیا، اب دیکھئے یہاں کب تک رہتا ہے، یہ جگہ وسط شہر میں ہے اور بہت ہی مناسب ہے، اگرچہ وسعت اور کشادگی کے لحاظ سے کتب خانہ کے لیے بہت ہی ناکافی ہے،

تشکیل راجستان کے بعد سے اس کتب خانہ کا تعلق محکمۂ تعلیمات راجستان سے ہوگیا ہے، صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم اے لائبریرین کے عہدہ پر فائز ہیں، جن کی وجہ سے کتب خانہ میں شان و شوکت کی ایک نئی بہار آگئی ہے، محکمۂ تعلیم راجستان نے کتب خانہ کے ساتھ ایک ریڈنگ روم کا بھی اضافہ کردیا ہے، روزانہ اخبار اور ماہانہ رسائل جاری ہیں، جن میں زیادہ تعداد ہندی رسائل و اخبارات کی ہے،

جنوری ۱۹۵۲ء میں نادر مخطوطات کی تحقیقات کے سلسلہ میں مصری علما کا ایک وفد حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی نشاندہی پر ٹونک آیا تھا، اس وفد نے چار روز تک اس کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور تقریباً تین سو کتابیں دیکھیں، ان میں سے مندرجہ ذیل اکیس مخطوطات کا (جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے نایاب تھے) عکس لیا تھا،

۱۔ تلقیح فہوم الاثر (اسماء الرجال)

یہ نسخہ مصنف کے زمانہ سے قریب کا لکھا ہوا ہے، قدیم نسخہ ہے، اول صفحہ پر طلاکاری ہے، یہ نسخہ مختلف شاہی کتب خانوں میں رہ چکا ہے،

۲۔ فہرست ابن ندیم قلمی (تاریخ علوم)

یہ نسخہ ناقص ہے اور آٹھویں یا نویں صدی کا مکتوب ہے، تاریخ کتابت درج نہیں ہے، خضر ابن عبداللہ جو کہ یحییٰ جوہری کے پوتے ہیں، کاتب ہیں،

۳۔ فہرست مولفات سیوطی (فہرست)

۴۔ مراۃ الجنان وعبرۃ الیقظان (")

۵۔ غریبین (لغت)

۶۔ قواعد المطارحہ (ادب عربی)

یہ نسخہ قدیم ہے اور غالباً ابتک طبع نہیں ہوا ہے،

۷۔ شرح الحماسہ للخطیب تبریزی۔ (ادب)

چھٹی یا ساتویں صدی کا لکھا ہوا ہے، اگرچہ یہ کتاب چھپ چکی ہے، مگر یہ نسخہ قدیم اور نادر ہے،

۸۔ شمس العلوم۔ (لغت)

یہ نسخہ اگرچہ طبع ہو چکا ہے، مگر یہ نسخہ نہایت صحیح، نادر اور قیمتی ہے، آٹھویں صدی کا لکھا ہوا ہے،

اس کا ایک قلمی نسخہ مصر میں ہے، جو مصنف کے بیٹے کے پاس رہا ہے،

۹۔ تحفۃ الکرام (سیر)

یہ نسخہ مختلف خطوں کا لکھا ہوا ہے،

۱۰۔ قواطع الادلہ (اصول فقہ)

اس کتاب کا واحد نسخہ استنبول میں ہے، اصولِ فقہ کی نہایت معتبر کتاب ہے۔

۱۱۔ مصنف عبدالرزاق

اگرچہ یہ نسخہ قریب زمانہ کا مکتوب ہے، مگر اس وجہ سے نادر ہے کہ اس کے صرف دو نسخے اور ہیں، ایک استنبول کے کتب خانہ میں اور دوسرا مکہ شریف میں، یہ نسخہ مکہ شریف سے نقل کرایا گیا ہے، اس نسخہ کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ریاست ٹونک کے ایک امیر مرحوم عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں مصنف عبدالرزاق (متن حدیث کی نادر معتبر کتاب) کے ایک نسخہ کی نقل عرب سے خرید کر آئی تھی، اس وقت کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب میں مصنف کا جو نسخہ ملا تھا، وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کتب خانہ ہی سے منتقل ہو کر عرب پہنچا تھا، غالباً شاہ صاحب کی مہر یا دوسرے علامات اس پر موجود تھے۔ (ص ۳۳)

۱۲۔ حادی الارواح۔ (وعظ)

یہ نسخہ مصنف کے زمانہ قریب کا لکھا ہوا ہے، سنہ ۶۲۳ھ میں یہ نسخہ بعلبک میں لکھا گیا ہے، اول ذخیرہ صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے،

۱۳۔ وفیات الاعیان (طبقات و تراجم)

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، مگر یہ نسخہ قدیم ہے، اور مصنف سے ایک صدی بعد کا لکھا ہوا ہے، اول صفحہ پر نواب وزیر الدولہ اور محمد علی خاں کی مہریں ثبت ہیں، محمد بن احمد بن ناصر ابن سلیمان کاتب ہیں،

۱۴۔ زاد المسیر (تفسیر)

یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے، یہ نسخہ نہایت صحیح اور نادر ہے، مصنف سے تقریباً پچاس سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن ابی الحسن علی بن محمد بن علی القرشی التیمی البکری البغدادی الفقیہ الحنبلی الواعظ الملقب بہ جمال الدین الحافظ (م ۵۹۷ھ) کی تصنیف ہے، یہ نسخہ ۶۵۵ھ میں کسی صاحب کے پاس رہا ہے، جن کا نام پڑھنے میں نہیں آتا، اول صفحہ طلائی کام سے آراستہ ہے،

۱۵۔ تلخیص (تفسیر)

بہت قدیم نسخہ ہے، مصنف کے زمانہ حیات کا لکھا ہوا ہے،

۱۶۔ جامع ابن بیطار (طب)

نسخہ نہایت قدیم ہے،

۱۷۔ ایجاز البیان لمعانی القرآن (تفسیر)

نادر نسخہ ہے، یہ تفسیر نجم الدین ابوالقاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی کی تصنیف ہے، مصنف نے یہ کتاب شہر (خجند) میں تصنیف فرمائی ہے، کتابت قدیم طرز کی ہے،

۱۸۔ آداب الصوفیہ (تصوف)

یہ نسخہ آٹھویں یا نویں صدی کا مکتوبہ ہے،

۱۹۔ نفثۃ الجانی والروح الریحانی تا ارشاد الی مہمات علم الاسناد،

یہ سات رسالے ایک جلد میں مجلد ہیں، اور اس میں مختلف علما کی اجازتیں اور حالات ہیں، امام شوکانی کی بھی اجازتِ حدیث ہے،

۲۰ - تاریخ ابن حجر

۲۱ - مصنف ابن ابی شیبہ (حدیث)

یہ نسخہ مختلف خطوں میں مکتوب ہے، جدولی شنجرفی، آخر سے ناقص ہے، اس وجہ سے کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں ہے،

قائدِ وفد محمد رشاد عبد المطلب نے کتب خانہ کے رجسٹر پر عربی زبان میں حسب ذیل تاثرات تحریر کیے ہیں،

"میں ٹونک کا کتب خانہ دیکھکر بہت خوش ہوا، اس لیے کہ میں نے یہاں قلمی کتابیں اور نادر نفیس نسخے پائے، اور کارکنانِ کتب خانہ نے بھی میری بہت مدد کی، مجھے امید ہے کہ یہ کتب خانہ اپنا اعلیٰ مقام حاصل کرے گا اور قلمی کتابوں کی طرف خاص طور پر توجہ کی جائے گی"۔

متذکرۂ بالا نوادر و مخطوطات کے علاوہ اور بھی سینکڑوں نادر اور نایاب کتابیں ہیں، ان میں سے مشتے نمونہ از خروارے، چند مخطوطات کا اور تذکرہ کیا جاتا ہے،

۱- شرح شمائل - مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد الاسفرائینی (م ۹۴۳ھ)

۲- الخیر الکثیر اور التفہیمات :-

شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ دونوں رسالے ایک مجموعہ میں نہایت پاکیزہ خط میں لکھے ہوئے ہیں، اگرچہ یہ دونوں چھپ چکے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب کے پہلے مسودہ سے منقول ہونے کے باعث ان کی قدر وقیمت باوجود چھپ جانے کے بہت زیادہ ہے۔

مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے :

"تفہیمات حضرت قدوۃ العلماء مولوی شاہ ولی اللہ صاحب منقول از مسودۂ اول قلمی خط فارسی، کاغذ سفید، درکتب خانہ یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علیخان بہادر دام اقبالہ والی ٹونک در سنہ ۱۲۹۰ھ داخل گردید"

اس عبارت کے ذیل میں دو مہریں ثبت ہیں، ایک مہر محمد علی خاں بہادر کی، دوسری وزیر الدولہ کی،

۳- کثیر الفوائد فی تصریح و توضیح امثال القرآن۔

اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے، امثال القرآن کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۲۷۷ھ سنہ تصنیف ہے،

۴- حاشیہ مشکوٰۃ (عربی) :- مصنف کا نام عطاء اللہ بن فضل شیرازی نیشاپوری المعروف بجمال حسنی ہے، یہ نسخہ بخط عربی خوشخط ہے، اول صفحہ مطلا اور جدول آسمانی ہے،

۵- لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح للشیخ عبد الحق حقی المحدث الدہلوی - (م ۱۰۵۲ھ)

یہ نسخہ قدیم الخط و ضخیم جلدوں میں ہے، پہلی جلد نہایت خوشخط خفیف سی کرم خوردہ، جلد دوم بادامی مجدول شنجرفی وسیاہی، پہلے ورق کے صفحہ پر یہ عبارت ہے،

حاجی عبد اللہ خلیفہ شیخ عبد الرزاق بن شیخ امام الدین قادری - اور یہ مہر ثبت ہے :- [شیخ عبد القادر]

۶- لباب الاصول فی اصول الحدیث :- یہ عربی میں اصول حدیث میں مختصر رسالہ ہے،

۷- اسئلۃ القرآن :- یہ کتاب محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی المتوفی ۶۶۰ھ کی تصنیف ہے،

۸- غریب القرآن المسمی بنزہۃ الخاطر وسرور الناظر للامام اللغوی فخر الدین محمد بن علی النجفی الطریحی: یہ نسخہ بھی قدیم الخط ہے،

۹- مجموعہ رسائل حجۃ الاسلام سیدنا اسمٰعیل شہیدؒ

۱۰- طیبی شرح مشکوٰۃ المصابیح : یہ علامہ حسین بن عبد اللہ بن محمد الطیبی م ۷۴۳ھ کی نہایت معتبر تصنیف ہے، کتابت نہایت اعلیٰ ہے۔

مدارجِ سلوک

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

(۲)

خواجہ عزیزاں علی رامیتنیؒ (۷۱۵ھ وفات) سلسلہ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ سے ہیں اور قطب وقت تھے، آپ کا ایک مختصر رسالہ[1] ہم تک پہنچا ہے، اس میں آپ رُوندہ راہ یعنی سالک کو دس شرطیں اپنے پیش نظر رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں، چونکہ ان کا زیادہ تر تعلق تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب سے ہی ہے اسلئے ہم یہاں اجمالاً ان شرائط کو پیش کرتے ہیں اور ان ہی پر سلسلۂ نقشبندیہ کے اذکار و اعمال کا باب ختم کرتے ہیں،

(۱) شرط اول طہارت ہے؛ طہارت کی چار قسمیں ہیں: طہارت ظاہر، طہارت باطن، طہارت دل، طہارت سر، طہارت ظاہر[1] سب ہی جانتے ہیں، لیکن پانی کی پاکی میں تا امکان احتیاط کرنی ضروری ہے، اسی طرح لباس کی پاکی میں کہ ان کا اثر باطن پر بہت ہوتا ہے، طہارت[2] باطن یعنی لقمۂ حرام و مشروبات حرام سے پرہیز، طہارت[3] دل یعنی دل کا صفاتِ ناپسندیدہ، غل و غش، کینہ و حسد، مکر و خیانت، بغض و عداوت و حب دنیا سے تصفیہ ہے، طہارت[4] سر توجہ بغیر حق سے پاک ہونا ہے۔

وصول الی اللہ کے لیے سالک اپنے ظاہر و باطن، قلب و سر کی تطہیر کرتا ہے، اسکے کچھ طریقے یہ ہیں:

(۲) شرط دوم: خاموشی یعنی زبان کو ناشائستہ کلام سے محفوظ رکھنا اور اس کو قرآن مجید کی تلاوت، امر معروف و نہی منکر کے ارشاد، علم سکھلانے اور اصلاح بین الناس میں مشغول رکھنا ہے،

لہ یہ رسالہ "رسائل ستہ ضروریہ" میں دوسرا رسالہ ہے، مجتبائی المطابع، میرٹھ ۱۳۰۹ھ میں چھپا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

هل يكب الناس على مناخرهم في النار الا حصائد السنتهم (رواه الترمذی) یعنی زبان کی بکواس ہی سے لوگ آگ میں اوندھے منہ جھونکے جاتے ہیں۔

کسی حکیم نے کیا خوب کہا ہے:

ایزد چو بنا کرد بحکمت تن و جاں　　در ہر عضوے مصلحتے کرد نہاں

گر مفسدے ندیدہ بودے ز زباں　　محبوس نمی کردے بزنداں دہاں

(۳) شرط سوم: خلوت و عزلت ہے، اس کی وجہ سے نظر حرام سے محافظت ہوتی ہے اور نظر حرام ابلیس کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہوتا ہے: النظر سهم مسمومة من سهام ابليس

ز تیر مکر شیاطیں بدہوش دو چشم　　ہلاک گردی اگر تیر کارگر یابی

خلوت کا فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ ناشائستہ چیزوں کے پکڑنے اور پاؤں حرام چیزوں کی تلاش میں چلنے اور کان ممنوع چیزوں کے سننے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، ان سلبی شرائط کی تکمیل ہی سے قلب پر غیب کے دروازے کھلنے لگتے ہیں، جب دنیا کے نقوش آئینۂ قلب سے مٹنے لگتے ہیں تو آخرت کے نقوش کا اس پر پرتو پڑتا ہے، اور جب قلب میں کامل صفائی پیدا ہو جاتی ہے تو وحدانیت کے نور کی تجلی ہوتی ہے، اب سالک "اہل تجلی" ہو جاتا ہے اور فریاد کرنے لگتا ہے کہ:

زاں می خوردم کہ روح پیمانۂ اوست　　مست شدہ ام کہ عقل بیمانۂ اوست

دودے بمن آمد آتشے در من زد　　زاں شمع کہ آفتاب پروانۂ اوست

(۴) شرط چہارم: روزہ ہے، اس کا فائدہ قہر نفس اور تشبہ بروحانیاں ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے اور حق تعالیٰ ہی اسکا اجر دیتے ہیں: الصوم لی وانا اجزی به (متفق علیہ) اور یہ دوزخ کی آگ سے سپر ہے، والصيام جنة من النار...

ہم کہتے ہیں کہ روزہ کی دو خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اگرچہ ساری عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہوتی ہیں، ایک یہ کہ روزہ کی حقیقت ترک کرنا ہے اور یہ باطن ہے، بصر سے مخفی، ریا کو اس کی طرف راہ نہیں، دوسری یہ کہ نیکی کا دشمن ابلیس ہے اور ابلیس کا لشکر شہوات، روزہ اس لشکر کو شکست دیتا ہے کیونکہ روزہ کی حقیقت ترک شہوات ہے۔

اسی لیے روزہ تصفیۂ قلب کے لیے نہایت مفید ہے،

(۵) شرط پنجم: ذکر ہے، تمام اذکار سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ:

بر تخت وجود ہر کہ شاہنشاہ است — اور اسوے عالم حقیقت راہ است

ہر نور یقیں کہ در دلِ آگاہ است — دستش ز بد و نیک جہاں کوتاہ است

زیں پیش ولے بود و ہزار اندیشہ — اکنوں ہمہ لا الہ الا اللہ است

اے خواجہ ترا غم جمال و جاہ است — اندیشہ باغ و راغ خرمن گاہ است

ما سوختگان عالم تجرید یم — مار ا غمِ لا الہ الا اللہ است

مرغ ذکر کے دو بال و پر ہوتے ہیں، جن سے وہ پرواز کر سکتا ہے، ایک پر حضور کا، دوسرا پر اخلاص کا، حضور سے مراد آگاہی ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ دانا و بینا و شنوا ہیں، سالک چاہے بلند آواز سے ذکر کرے (جہراً) یا پست آواز سے (سراً) اور اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ذاکر اپنے گفتار و کردار سے نہ دنیا کا خواہاں ہو نہ مال و جاہ کا، نہ کسی چیز کا جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی وہ عقبیٰ کا طالب ہو یعنی نہ بہشت نہ حور و قصور، نہ بہشت کے انہار و اشجار و اثمار کا، بل ھم الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ یہ ان لوگوں میں ہو جو اللہ کا ذکر حباً لجمالہ وجلالہ کرتے ہیں، نہ کہ جنت کے منکوح و مطعوم کی خاطر!

اخلاص کے متعلق جب حضور انورؐ سے کسی نے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان تقول ربی اللہ ثم تستقیم کما امرت — اخلاص یہ ہے کہ تو کہے اللہ میرا رب ہے پھر تجھے جس چیز کا حکم دیا گیا ہے، اس پر جما رہے،

امام غزالی اس کی تصریح فرماتے ہیں:

ای لا تعبد ھواک ونفسک ولا تعبد الا ربک وتستقیم فی عبادتہ کما امرت وھذا اشارۃ الی قطع ما سوی اللہ عن مجری النظر وھو الاخلاص حقاً — یعنی تو اپنے خواہشات کی اور اپنے نفس کی عبادت نہ کرے اور سوائے اپنے رب کے کسی کی عبادت نہ کرے اور اسکی عبادت میں استقامت سے کام لے جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور یہ اشارہ ہے نظر سے ما سوی اللہ کو دور کر دینے سے اور یہی حقیقی اخلاص ہے

ذکر میں حضور و اخلاص پر زور دینے کے بعد خواجہ عزیزانؒ تاکید فرماتے ہیں کہ درمیان ذکر میں یہ کلمۂ بازگشت کہتا جائے،

"الٰہی مقصود من توی و از تو را می خواہم"

(۶) شرط ششم "نگاہداشت خاطر" ہے، اس سلسلہ میں خواجہؒ کے افادات کے پیش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ "خاطر" کیا ہے، صوفیہ کے ہاں جو چیز بے قصد دل میں گزرتی ہے، اسکو "خاطر" کہا جاتا ہے، خواص صوفیہ خاطر صرف اسی خیال کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے آئے، یا ملک کی طرف سے، جو خطرے نفس و شیطان کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں گو ان کو بھی خواطر کہا جاتا ہے لیکن درحقیقت جو چیز شیطان کی طرف سے آتی ہے، وہ وسواس ہے، اور جو نفس کی طرف سے آتی ہے، اس کو ہاجس (جمع ہواجس) کہا جاتا ہے، یہ بھی مانا جاتا ہے کہ حرام خوار کے قلب میں

ہمیشہ وساوس ہی آتے ہیں اور جس کا لقمہ مشتبہ ہوتا ہے، اس کے خواطر وسواس و ہوا جس سے ملے جلے ہوتے ہیں۔

خواجہ عزیزانؒ خواطر کی تقسیم چار قسموں میں فرماتے ہیں، خاطر رحمانی، خاطر ملکانی، خاطر شیطانی، خاطر نفسانی، آپ کے ہاں خاطر رحمانی تنبیہ غفلت کا نام ہے، اور خاطر ملکانی ترغیب طاعت کا، خاطر شیطانی تزیین معصیت کا اور خاطر نفسانی مطالبۂ شہوات کا، سالک کو جب ذکر کے وقت خواطر آنے لگیں تو اس کو ان کی نفی کرنا چاہیے اور اپنے ذکر میں مصروف رہنا چاہیے، اس پر خود روشن ہو جائے گا کہ کن خواطر کو قبول کرنا چاہئے اور کن کو رد، اور اگر ان میں وہ تمیز کرنے سے عاجز ہو تو پھر حق تعالیٰ سے کہنا چاہیے کہ

خداوندا میدانی کہ نمی دانم ومی دانم کہ می دانی انچہ خیریت ست آں کرامت فرما

یعنی حق تعالیٰ آپ جانتے ہیں کہ میں نہیں جانتا اور میں جانتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں، جو خیر ہے وہی عطا فرمائے! اور یہ دعا پڑھنی چاہیے:

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا	اے اللہ ہمیں حق کو حق کر دکھلا اور اسکی
اتباعہ وارنا الباطل باطلا و	پیروی نصیب کر اور باطل کو باطل کر دکھلا
ارزقنا اجتنابہ ولا تکلنا الی	اور اس سے دوری عطا فرما اور ہمیں اپنے
انفسنا طرفۃ عین ولا اقل من	نفس کے حوالہ نہ کر ایک لحظہ کے لیے اور
ذلک وکن لنا ولیا وحافظاً	نہ اس سے کم عرصہ کے لیے اور ہمارا
وناصراً وعونا ومعینا وعلی	والی وحافظ وناصر اور مددگار و معین
کل خیر دلیلا وملقنا ومویدا	ہو جا اور ہر خیر کی طرف ہماری دلالت
ربنا آتنا من حضرنا ومن غاب عنا	فرما اور اس کی تلقین فرما اور اس میں

وکل مومن ومومنۃ فی الدارین	ہماری مدد کر۔ اے رب ہمارے ہم میں جو حاضر ہیں
حسنا یا واسع المغفرۃ ویا ارحم	اور جو غائب، مومن ومومنہ تمام کو دارین میں بھلائی
الراحمین	عطا فرما اور تو وسیع المغفرۃ ہے اور سب سے زیادہ رحم

(۷) شرط ہفتم۔ رضا بقضاء اللہ ہے، اور توکل و تفویض کا بھی اسی سے تعلق ہے۔

جب حق تعالیٰ کے کریم ورحیم وغفور وستار ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو قلب میں رجا کا قوی ہونا ضروری ہے، اور جب ان کے قہار اور شدید العقاب اور شدید البطش ہونے پر نظر جاتی ہے تو خوف قوت پکڑتا ہے، جب توفیق پر نظر پڑتی ہے تو امید پیدا ہوتی ہے،

لیکن اختیار حق تعالیٰ کو حاصل ہے جس کو چاہا توفیق دی، نہ چاہا نہ دی، کہ

توفیق عزیز است بہر کس ندہند	وایں گوہر ناسفتہ بہر خس ندہند

اور جب اپنی تقصیر پر نظر پڑتی ہے تو خوف پیدا ہوتا ہے،

بندہ ہمہ بہ کہ بہ تقصیر خویش	عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزا وار خداوندیش	کس نتواند کہ بجا آورد

انسان کے لیے خیر اسی میں ہے کہ جب تک دنیا میں رہے خوف ورجا کے درمیان رہے، نہ حق تعالیٰ کے مکر سے مامون ہو جائے نہ ان کی رحمت سے مایوس، "لا تامن ولا تیئاس" اسی لیے حکم شرعی ہے،

ایمن مباش خواجہ ونومید ہم مشو	اسلام درمیانۂ حق ورجا بود

(۸) شرط ہشتم۔ صحبت صالح کا اختیار کرنا ہے، اور مفسد کی صحبت ترک کرنا، اس بارے میں خواجہ عزیزانؒ کی ایک رباعی بہت مشہور ہے:

با ہر کہ نشستی ونشد جمع دلت	وز تو نرہید زحمت آب و گلت

از صحبت او اگر تبرا نہ کنی — ہر گز نکند روحِ عزیزاں بحلت

یعنی اگر تو کسی شخص کے پاس بیٹھے اور تجھے جمعیت خاطر نصیب نہ ہو اور دنیا کی کوفت و زحمت تیرے قلب سے دور نہ ہو تو ہر ایسے شخص کی صحبت سے اگر تو کنارہ نہ کرے تو خواجہ عزیزاں کی روح تجھے کبھی معاف نہ کرے گی،

(۹) شرط نہم. بیداری ہے. اس میں بہت سے فائدے ہیں: ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے تخلق باخلاق اللہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے لاتأخذہ سنۃ ولا نوم اور تخلق باخلاق اللہ سے قرب حق حاصل ہوتا ہے، جیساکہ کہا گیا ہے

گفتم بچہ خدمت بوصالت برسم — گفتا کہ تخلقوا باخلاق اللہ

اور رات عاشقوں کا خلوت خانہ ہوتی ہے جس میں وہ حضرت بے نیاز سے راز و نیاز کرتے ہیں، بے تشویش اغیار:

از صبح وجود بے خبر بود عدم — انجا کہ من و عشق تو بودیم بہم

در روز اگر کسے نیابم محرم — شب ہست و غمت ہست بر آمیش غم

سالکانِ راہ کو جو بھی دولت و سعادت ملی ہے وہ رات ہی میں ملی ہے

دولت شبگیر خواہی خیز و شب را زندہ دار

خفتہ نابینا بود، دولت بہ بیداراں رسد

(۱۰) شرط دہم. نگاہداشت لقمہ ہے. لقمہ حلال و پاک چاہیے، یہ جملہ فرائض میں سے ایک فرض ہے. قال اللہ تعالیٰ:

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً (پ ۱۴ ع ۱۶) — سو کھاؤ جو روزی دی اللہ نے تم کو حلال اور پاک۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عبادت کے دس جزو ہیں، ان میں سے نو جزو تو حلال روزی کا طلب کرنا ہے اور باقی عبادت جو رہی وہ ایک جزو ہے، "حلال" کے معنی یہ ہیں کہ روزی کے کسب کے وقت کوئی گناہ کا ارتکاب نہ ہو اور "طیب" کے معنی یہ ہیں کہ اس کے کھاتے وقت نیت یہ ہو کہ اس سے حق تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی قوت جسم میں پیدا ہو،

اب رزق حلال و پاک کے حاصل کرنے کے بعد اسراف نہ کرنا چاہیے:

گرچہ خدا گفت کلوا و اشربوا — از پے آں گفت ولا تسرفوا

اور کھاتے وقت ذکر سے غافل نہ ہونا چاہیے، غفلت سے کھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس ذبیحہ کا کھانا جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ — جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسکو کھاؤ

ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی لقمہ بغیر ذکر اللہ کے نہ کھایا جائے اور غافلوں کے ساتھ بھی نہ کھانا چاہیے،

منشیں با بداں کہ صحبت بد — گرچہ پاکی ترا پلید کند

آفتابے بداں بزرگی را — ذرہ ابر ناپدید کند

گوہر از ناقصانِ راہ مطلب — زانکہ ایں مایہ کاملے دارد

اور یہ بھی ضروری ہے کہ کھانے پکانے والا با طہارت ہو اور باذکر ہو تاکہ یہ غذا غفلت و تیرگی کا سبب نہ ہو جائے۔

غالب سے منسوب دوسرا سکّہ اور اس کی حقیقت

از جناب مالک رام صاحب

معارف کے فروری ۱۹۵۹ء کے شمارے میں میرا مضمون "غالب پر سکہ کا الزام اور اسکی حقیقت" شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غالب پر انگریزوں نے جو الزام لگایا تھا کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے لیے یہ سکہ کہا تھا۔

بزر زد سکۂ کشور ستانی　　　سراج الدین بہادر شاہ ثانی

تو یہ غلط تھا، یہ سکہ درصل حافظ غلام رسول ویراں تلمیذ استاد ذوق مرحوم نے لکھا تھا، اور ویراں کا کارنامہ خواہ مخواہ غالب کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا گیا، اسی دوران میں ایک اور سکہ منظر عام پر آیا ہے، جو منشی جیون لال نے غالب سے منسوب کیا ہے، اور جس کا ذکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے مضمون (معارف، نومبر ۱۹۵۸ء ص ۳۹۳) میں ہے، منشی جیون لال کے لفظ یہ ہیں:

"دیگر سکہ شعر۔ مرزا نوشہ ؎

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ　　　سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

یہ منشی جیون لال ماتھر کایستھ، کمشنر دہلی کے دفتر میں ملازم تھے اور غالب وہاں فارسی خط و کتابت ان سے متعلق تھی، غالب کے ایک خط موسومہ میر مہدی مجروح میں بھی ان کا نام آیا ہے[1]، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے اور دلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد بھی وہ انگریزی حکومت کے

[1] اردوے معلی ص ۱۲۹ (لاہور مطبع کریمی ۱۹۲۲ء)

ملازم رہے، جب مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہ میرٹھ سے آکے دلی پر قابض ہوگئی، تو یہ بے کار ہوگئے، ان ایام میں وہ یہ روزنامچہ لکھتے رہے، جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون میں ہے۔ (اور جس کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غدر کی صبح و شام" کے نام سے شائع کیا تھا) بہرحال دلّی والے جانتے تھے کہ وہ انگریز کمشنر کے دفتر کے ملازم ہیں، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس دوران میں قلعہ میں بار پا سکے ہوں؛ بلکہ اگر وہ اس کی کوشش کرتے، تو قدرتی طور پر لوگ انھیں شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے اور ان کی جان معرض خطر میں آجاتی، انھوں نے یہ روزنامچہ انگریزوں ہی کے لیے لکھا تھا، ان کے اسے مٹکاف کی خدمت میں پیش کرنے ہی سے ان کا مقصد ظاہر ہے، میری نظر میں گوری شنکر اور جیون لال میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر انگریزوں کا تنخواہ دار ملازم تھا، اور یہ غالباً تنخواہ نہیں لیتے تھے، ورنہ انگریزوں کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھنے میں دونوں کی خدمات یکساں ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی یہی بات ذرا زیادہ صراحت سے لکھی ہے[1]،

ان حالات میں ظاہر ہے کہ منشی جیون لال نے جو سکہ غالب کے نام سے لکھا ہے، یہ ان کی اپنی دید تو ہو نہیں سکتی، غالباً کسی نے ان سے اسی طرح بیان کیا اور انھوں نے یونہی لکھ دیا، اور اس معاملے میں ہم گوری شنکر کی کارگذاری دیکھ ہی چکے ہیں، جو اپنی آنکھوں دیکھی بیان کرنے کا مدعی ہے، بس اس صورت میں جیون لال پر گوری شنکر سے زیادہ بھروسہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ اسی لیے میرے خیال میں یہ دوسرا سکہ بھی غالب کا نہیں، وہ خود بھی اس سے انکاری ہیں، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں[2]:

"میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔"

یہاں ان کا اصل بیان یہ ہے کہ "میں نے سکہ کہا نہیں"۔ منطقی لحاظ سے مابعد کی شرط محض بفرض محال ہے،

[1] نقش آزاد، ص ۴۰۳ (حاشیہ) نیز دیکھیے "غالب" از مہر ص ۳۱۸ (طبع چہارم) [2] اردوے معلی، ص ۲۴۹

جو بدرجۂ مجبوری بیان ہوئی ہے، اس لیے اس سے استدلال درست نہیں ہوگا، اگر انھوں نے یہ دوسرا سکہ کہا ہوتا تو یہ مطالبہ نہ کرتے کہ:[1]

"باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔"

اگر ان کے دل میں اس دوسرے سکے کا چور ہوتا تو وہ کبھی اس بے باکی اور تحدی سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے، کیونکہ جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گوری شنکر والا سکہ ان کا کہا ہوا نہیں، وہیں یہ بھی عین ممکن تھا کہ تحقیقات کے دوران میں یہ دوسرا جیون لال والا سکہ برآمد ہو جاتا، لوگوں نے بہادر شاہ کے مقدمے میں کس طرح ان کے خلاف گواہیاں دی تھیں، جیون لال کے بیان کے مطابق غالب نے یہ سکہ سر دربار پیش کیا تھا، اگر پوچھ گچھ ہوتی تو کیا کوئی ان کے خلاف شہادت نہ دیتا؟ اس پر "صفائی اور بے گناہی" تو کیا ثابت ہوتی، لینے کے دینے پڑ جاتے، اگر انھوں نے واقعی یہ سکہ کہا ہوتا تو ان کا یہ مطالبہ آگ سے کھیلنے کے مرادف تھا، غالب کی دنیوی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی سے انکار نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بات خیال میں بھی نہیں آ سکتی کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ یہ خطرہ مول لیا ہو، اسی لیے میرا یقین ہے کہ یہ دوسرا سکہ بھی ان کا کہا ہوا نہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سکہ

"خود بکار بکار (کذا) کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا"[2]

اور میرے دریافت کیے ہوئے شعر (بر زر آفتاب الخ) کا خوبصورت انداز غالب کے طرز اسلوب سے ہم آہنگ ہے، اب تک سکے سامنے آئے ہیں، لیکن اس "قدر دلکش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔"[3]

خدا معلوم ان کا مدعا کیا ہے! کیا "طرز اسلوب" (؟) سے ان کی مراد یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں زر و سیم

---

[1] اردوئے معلی، ص ۱۱۲ (بنام بیخبر)، [2] معارف نومبر ۱۹۵۵ء ص ۳۹۴، [3] ایضاً مئی ۱۹۵۹ء ص ۳۹۲

کی تشبیہیں سورج اور چاند سے دی گئی ہیں، یہ غالب کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں سوجھ سکتی تھیں، کیونکہ اور کوئی بات اس سکے میں قابل ذکر نہیں، تو وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ فارسی شاعری میں ازل سے ہوتا آیا ہے، غالب پہلے شاعر نہیں جنھوں نے یہ تشبیہیں لکھی ہوں، اور سکوں کے لیے تو یہ اتنی سامنے کی چیز ہے کہ تقریباً ہر موقع پر سونے چاندی کے سکوں کے لیے مہر و ماہ کا ذکر کیا گیا ہے، خاندان تیموریہ ہی کے بعض بادشاہوں کے سکے ملاحظہ کیجئے:-

اورنگ زیب عالمگیر:

چاندی کا سکہ ؎	سکہ زد در جہاں چو بدر منیر	شاہ اورنگ زیب عالم گیر
سونے کی اشرفی ؎	سکہ زد در جہاں چو مہر منیر	شاہ اورنگ زیب عالم گیر
جہاندار شاہ :-	بزد سکہ در ملک چوں مہر و ماہ	شہنشاہ غازی جہاندار شاہ
محمد شاہ رنگیلا :-	ز فضل حق شہنشاہ محمد شاہ دیں پرور	دریں عالم زدہ سکہ ز مہر و ماہ روشن تر

اسی سلسلے میں صادق الاخبار کا ایک اور اقتباس بھی درج کرتا ہوں، جو دلچسپی سے پڑھا جائیگا، اس کی ۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ، ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں (ص ۴ پر) لکھا ہے:

"سکہ ہائے شاہی از طبع عالی عرفی زماں، خاقانی دوراں فیضی وقت مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانیدار، رئیس دادری [دادری]

۱- سکہ زد در جہاں بعون الاہ — حامی دین حق بہادر شاہ

(ان دونوں مصرعوں سے تاریخ ہجری ۱۲۷۳ برآمد ہوتی ہے، مگر ملفوظی)

۲- بشرق و غرب زدہ سکہ ہمچو مہر و ماہ — ابو ظفر شہ عالی نسب بہادر شاہ

۳- بہ ہر سکہ شاہی زدہ بہادر شاہ — بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

۴- بہ ہر سکہ شاہی زدہ بفضل الٰہ — ابو ظفر شہ گیتی ستان بہادر شاہ"

مدیر اخبار نے ان سکوں پر یہ حاشیہ لکھا ہے:-

"یوں تو سب سکے خوب ہیں، مگر جناب مولانا صاحب نے سکۂ تاریخی میں کمال کیا ہے اور جس سکہ میں ذکر کلمہ ہے، وہ بھی خالی از برکت نہیں"

یہاں بھی دوسرے شعر میں زر و سیم کی مناسبت سے مہر و ماہ کی تشبیہ موجود ہے،

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ منشی جیون لال نے بھی سنی سنائی بات پر یقین کر کے یہ سکہ غالب کے نام لکھ دیا۔ یہ غالب کا کہا ہوا نہیں، ورنہ وہ کبھی انگریزوں سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے،

آخر میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے ایک شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انھوں نے جہاں دستنبو کا حوالہ دیا ہے[1]، وہاں صراحت سے لکھا ہے "مملوکہ راقم" حالانکہ یہ مطبوعہ کتاب ہے، جو ممکن ہے عام طور پر نہ ملتی ہو، لیکن تاہم اس کے نسخے بعض اور لوگوں کے پاس یا کتاب خانوں میں بھی ضرور ہوں گے، لیکن انھوں نے اپنے دونوں مضمونوں میں "روزنامچۂ جیون لال" کے قلمی نسخے کے حوالے متواتر دیے ہیں اور کسی جگہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آخر یہ نسخہ ہے کہاں۔ کیا ان کی ذاتی ملک ہے یا کسی کتاب خانے میں، تاکہ اگر کوئی شخص بھی اس سے استفادہ کرنا چاہے یا ان کے دیے ہوئے حوالے ہی کی تصدیق کرنا چاہے تو کر سکے۔ مخطوطات کے حوالے دینے میں جو اصول برتے جاتے ہیں، یقیناً یہ ان سے مخفی نہیں ہوں گے۔

---

[1] معارف مئی ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۵ نیز ۳۹۶ (حاشیہ)

شعر الہند حصہ اول

اس میں قدماء کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے،

(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

قیمت: ہے ۵۰ نیا پیسہ

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

رسائل و اخبارات کے خاص نمبر

چراغ راہ اسلامی قانون نمبر جلد اول و دوم
مرتبہ جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، رنگین ٹائٹل، ضخامت بالترتیب ۴۵۴ و ۳۵۰ صفحات، قیمت بالترتیب للعہ و ہے، پتہ دفتر چراغ راہ کراچی نمبر ۱

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس ضخیم نمبر میں اسلامی فقہ و قانون سے متعلق بلند پایہ علمی اور تحقیقی مقالات کو جمع کیا گیا ہے، پورا نمبر نو مختلف ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قانون اور اصول قانون، دوسرے میں اسلام کے تصور قانون، تیسرے میں اسلامی قوانین کا بعض دیگر غیر اسلامی قوانین سے تقابل، چوتھے میں اسلامی فقہ و قانون کے ماخذ، پانچویں میں قانون اسلامی کی تاریخ و تدوین اور ساتویں باب میں موجودہ دور میں اسلامی قانون کی تشکیل و نفاذ سے متعلق بلند پایہ مضامین ہیں، چھٹے باب میں دستور شعر کے عنوان سے اسلامی عدل و قانون سے متعلق قدیم و جدید شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے، آٹھویں باب میں ایک تحریری سمپوزیم ہے جس میں اسلامی فقہ و قانون کے متعلق اکابر علماء کے قلم سے چند سوالات کا جواب ہے، اور نویں باب میں اسلامی قانون و فقہ کی بعض اہم کتابوں پر ایک مختصر مقالہ اور انکی فہرست ہے، مقالہ نگاروں میں متقدمین علماء میں علامہ ابن خلدون اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لیکر مستشرقین سر الفریڈ ویننگ، جارج وائٹ کراس پیٹن ڈاکٹر ایس ایس اونار، عربی ممالک کے ڈاکٹر عبد القادر عودہ شہید، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء، پروفیسر محمد ابوزہرہ، ڈاکٹر معروف دوالیبی، ڈاکٹر صبحی محمصانی اور ہند و پاک کے ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی،

مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر رفیع الدین جیسے اکابر علماء اور دوسرے اہل قلم میں ہمارے رفیق مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی وغیرہ شامل ہیں، شروع میں لائق مرتب نے اس نمبر میں حصہ لینے والے مشہور حضرات کا اجمالی تعارف کرایا ہے اور سب سے زیادہ مفید کام یہ کیا ہے کہ آخر میں عربی، انگریزی، اردو کی متعدد قانونی اور فقہی کتابوں اور بعض اہم مقالات کی ایک طویل فہرست دیدی ہے، غرض اسلامی قانون پر اس نمبر میں بہت سا مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے، پاکستان میں اسلامی قانون کی تشکیل میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لائق مرتب کو ہم اس تحقیقی، علمی اور دینی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں، یہ نمبر فقہاء اور اسلامی فقہ سے دلچسپی رکھنے والوں اور قانون کے طلباء اور ماہرین کے مطالعہ کے لائق ہے،

نقوش مکاتیب نمبر جلد اول ودوم مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، مجموعی ضخامت ۱۰۴۰ صفحات، قیمت عـہ، پتہ: ادارۂ فروغ اردو (ایبک روڈ انارکلی) لاہور،

مدیر نقوش اس سے پہلے مختلف مفید عنوانوں پر کئی ضخیم نمبر نکال چکے ہیں، یہ مکاتیب نمبر ہے جس میں ہندوستان کے مختلف طبقوں کے اکابر ومشاہیر کے خطوط جمع کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر اب مرحوم ہو چکے ہیں، انھوں نے ان مکاتیب کے جمع کرنے میں جو مشقت اٹھائی ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کام کرنے کا اتفاق ہو چکا ہے، اردو میں اتنے مشاہیر کے خطوط کا یہ نہایت دلچسپ اور رنگارنگ مجموعہ ہے۔ شروع میں غلام رسول صاحب مہر نے علم وادب میں خطوط کا درجہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے خط نگاری کی اہمیت، اردو خطوط نگاری کا جائزہ اور سرسری تبصرہ، مالک رام نے اردو کے منفرد اور صاحب طرز خطوط نگاروں کا تعارف وتذکرہ، اور دوسری جلد کے آخر میں محمد عبد اللہ قریشی نے مشاہیر کے

مختصر سوانح لکھے ہیں، آخری اور دوسرا مقالہ نہایت اہم ہے، ان سے اس نمبر کی افادیت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے، شروع میں مشہور ادیبوں کے خطوط کا عکس اور فوٹو ہے، یہ نمبر مرزا غالب اور سرسید سے لیکر مہدی بیگم تک اور پھر اس دور کے ممتاز لوگوں کے مکاتیب پر مشتمل ہے، خطوط کے ابتک اردو میں کئی مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن مدیر نقوش کا یہ کارنامہ بڑا غیر معمولی اور اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے غیر مطبوعہ اور نادر خطوط کا اس قدر وسیع اور گرانقدر ذخیرہ مہیا کر دیا ہے، جس سے ادب وانشاء اور گذشتہ سو سالہ دور کی علمی، سیاسی ادبی اور سماجی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، لائق مرتب کی یہ علمی وادبی خدمت لائق تحسین ہے،

ہمایوں سالنامہ مرتبہ جناب بشیر احمد صاحب، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۷۲، قیمت عـہ، پتہ المنظر ۳۲ لارنس روڈ لاہور

مشہور علمی رسالہ ہمایوں مالی دشواریوں کی وجہ سے عرصہ سے بند ہو گیا ہے، مگر اسکی تلافی کے لیے حسب معمول اس کا یہ سالنامہ نکالا گیا ہے، اس میں ادبی وفنی، تہذیبی وثقافتی اور شخصیات سے متعلق مضامین، افسانے، ڈرامے اور بلند پایہ نظمیں اور غزلیں پیش کی گئی ہیں، جو مرتب کے اعلیٰ ادبی مذاق کا نمونہ ہیں، ادب وفن میں "دس سال کا اردو ادب" اور "بھاگ متی کا افسانہ" تحقیقی مضامین ہیں، تہذیب ومعاشرت کے زیر عنوان بھی مفید، موثر اور اہم مقالات ہیں، ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی نے اپنے حالات بڑے دلچسپ انداز شستہ اور شگفتہ زبان میں لکھے ہیں، نظم وغزل کے حصے میں جوش، حفیظ، جگر، فراق، اسد ملتانی، اثر لکھنوی، احسان دانش، سید عابد علی عابد، قتیل شفائی، فیض احمد فیض اور عبد المجید حیرت جیسے مشاق اور قادر الکلام شعرا نظر آتے ہیں، آج کل جبکہ سطحی اور تیسرے درجہ کے رسالوں کی بھرمار ہے یہ نمبر دیکھکر بڑی مسرت ہوئی، ادبی وعلمی حیثیت سے یہ نمبر اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

اورنٹیل کالج میگزین مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، خوبصورت ٹائپ، سالانہ چندہ للعہ/ اس نمبر کی قیمت صہ/ پتہ: اورنٹیل کالج، لاہور،

لاہور کا مشہور بلند پایہ علمی رسالہ اورنٹیل کالج میگزین اپنی علمی روایات کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے، فروری اور مئی ۱۹۵۸ء کا نمبر ملا کر یہ خاص نمبر شائع ہوا ہے، جو حسب ذیل مقالات پر مشتمل ہے: داستان امیر حمزہ کی تصویریں، مثنوی ابر گہر بار، حول مخطوط من دیوان شعر الباخرزی، اہمیۃ الروایۃ الاسلامیہ، خواجہ میر درد کا خاندان، افسوس ہے کہ ہمیں جو نمبر موصول ہوا ہے اس میں تیسرا اور چوتھا مقالہ جڑنے سے رہ گیا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب کا خطبۂ استقبالیہ اور ڈاکٹر مس خدیجہ کا خطبۂ صدارت ہے، جو ۲۳ نومبر ۵۷ء کو یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے ۸۸ ویں یوم تاسیس پر پڑھے گئے تھے، قاسم لاہوری کا ایک تذکرۂ شعراء بنام "مردم دیدہ" جو بالاقساط شائع ہو رہا ہے، اس شمارہ میں بھی ہے، اس اہم اور نادر تذکرہ کی ترتیب و تصحیح ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کی ہے، ایک بڑا مفید کام یہ کیا گیا ہے کہ فروری ۴۲ء سے نومبر ۵۷ء کے پرانے رسالوں کے مضمون نگاروں اور مضامین دونوں کی فہرست مرتب کی گئی ہے، ۴۲ء سے پیشتر کی فہرست بھی پہلے نکل چکی ہے،

مہر نیمروز وحشت نمبر - مرتبہ جناب حسن مثنیٰ ندوی، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۲ر، پتہ ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی۔

جناب رضا علی وحشت کلکتوی اس دور کے اساتذۂ شعر و سخن میں تھے اور بنگالی ہونے کے باوجود زبان پر اہل زبان کی سی قدرت رکھتے تھے، جدید شاعری کے مقابلہ میں قدیم شاعری اور قدیم روایات کے دلدادہ تھے، پاکستان کے مشہور ادبی رسالہ مہر نیمروز نے ان کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، جس میں جناب وحشت کے عام حالات، شاعرانہ کمالات اور خصوصیات پر بلند پایہ مضامین فراہم کیے گئے ہیں،

اور ان کی شاعری سے متعلق علامہ شبلی، مولانا حالی، ڈاکٹر اقبال، مولانا شرر، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، سید امداد امام اثر، شوق قدوائی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، اور مرزا کاظم حسین جیسے اکابر فن کی منثور اور اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، حسرت موہانی اور ناطق لکھنوی وغیرہ مشاہیر شعراء کی منظوم رائیں شامل ہیں جس کے بعد ان کی مہارت فن میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے، اور آخر میں جناب وحشت کے دو ادبی مقالے، چار اہم خطوط اور ان کے دیوان اور ترانۂ وحشت کا انتخاب شامل کر دیا گیا ہے، دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے کیا ہے، اس انتخاب اور وحشت کے خطوط و مقالات نے اس نمبر کی اہمیت و افادیت اور بڑھا دی ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق میں یہ نمبر پسند کیا جائے گا،

البصیر شبلی نمبر - مرتبہ جناب غلام دستگیر و سردار محمد صاحب، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۱۳، قیمت درج نہیں، پتہ: اسلامیہ کالج، چنیوٹ، پاکستان۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ جد و جہد آزادی میں خاص اہمیت رکھتا ہے، مولانا شبلی اسی سال پیدا ہوئے تھے، گذشتہ سال یعنی ۱۹۵۷ء ان کی پہلی صد سالہ جوبلی کا سال تھا، دار المصنفین کو ان کے خیالات، مقاصد اور پیش نظر علمی کاموں کی تکمیل کے لیے ٹھیک ان کی وصیت کے مطابق ان کے لائق ترین شاگردوں نے قائم کیا تھا، اس لیے ان کی یادگار منانے کا اصلی حقدار وہی تھا، لیکن مولانا کی شخصیت اتنی جامع اور ان کے کمالات اس قدر گوناگوں اور وسیع ہیں کہ ان کی شایان شان یادگار منانے کے لیے جیسے سرمایہ کی ضرورت تھی، سر دست اس کا سامان نہیں تھا، دوسرے دار المصنفین خود ان کی مجسم یادگار ہے، جس سے انشاء اللہ ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، اس لیے اس کو اس قسم کی رسمیات کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی، مگر ہم کو مسرت ہے کہ بعض دوسرے اداروں نے اس تقریب کو انجام دیا، چنانچہ اسلامیہ کالج چنیوٹ نے مولانا کی

صد سالہ جوبلی کے موقعہ پر دسمبر ۱۹۵۰ء میں البصیر کا شبلی نمبر نکالا تھا۔ اس نمبر کی تیاری میں مرتبین نے دار المصنفین کے اکابر کی طرف بھی رجوع کیا، اس سلسلہ میں بعض نادر چیزیں بھیج دی گئی تھیں، اور ہمارے محترم رفیق کار سید صباح الدین صاحب نے دو مقالے لکھے تھے، جو اس نمبر میں چھپے ہیں، دوسرے مضامین میں بھی مولانا کے حالات، شخصیت، علمی مرتبت، ادبی حیثیت، تصنیفات، شاعری اور دوسرے علمی و عملی کمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن بعض مضمون نگاروں کا لب و لہجہ حیات شبلی کے مولف کی نسبت اس لیے سخت ہو گیا ہے کہ سید صاحبؒ نے سرسید اور شبلی کے اختلاف فکر و نظر کا تذکرہ کر دیا ہے، مگر جب یہ ایک حقیقت ہے، تو پھر ایک مورخ اور سوانح نگار کا قلم اس کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، پھر یہ بھی حیرت انگیز ہے کہ مولانا شبلی کے تمام کمالات کو صرف علی گڑھ اور سرسید ہی کا فیض قرار دیا جائے، ان ناخوشگوار بحثوں کو اس نمبر یں چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ان باتوں سے قطع نظر یہ نمبر اس لحاظ سے مفید ہے کہ مولانا کے متعلق مختلف قسم کے مضامین اسمیں جمع کر دیے گئے ہیں، شروع میں مولانا کے ایک خط کا عکس اور فوٹو دیا گیا ہے، اور آخر میں اڈیٹوریل کے علاوہ ایک مقالہ انگریزی میں بھی ہے، کتابت و طباعت کی جانب مزید توجہ اور اہتمام کی ضرورت تھی،

ماہنامہ صبا شبلی نمبر - مرتبہ جناب سلیمان ادیب صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۱۰، قیمت عہ، پتہ: انجمن ترقی اردو، حیدر آباد۔

ماہنامہ "صبا" نے بھی شبلی نمبر نکالا ہے، جس میں مولانا کے حالات، ان کے افکار و خیالات، ادب اور شاعری سے متعلق چند مقالات اور ان کے اردو، فارسی کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے، یہ امر باعث مسرت ہے کہ لوگوں میں شبلی پر کام کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو رہا ہے لیکن

یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ ان کے علمی و مذہبی کمالات، قومی و ملی خدمات اور ادبی و علمی کارناموں وغیرہ سے تعرض کرنے کے بجائے غیر ضروری بحثوں میں پڑ جاتے ہیں، اس نمبر کے بعض مضامین ترقی پسند ادیبوں کی بے راہ روی کا نمونہ ہیں، اور بعض چیزیں تو مولانا کے متعلق ایسی لکھی گئی ہیں جو غلط اور مہمل ہیں، تاہم بعض مضامین مفید اور قابل قدر ہیں، جس سے مولانا کے حالات و کمالات پر بھی روشنی پڑتی ہے،

آجکل ابو الکلام نمبر - مرتبہ جناب بال مکند عرش ملسیانی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت عہ، پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱، دہلی نمبر ۶

ماہنامہ آج کل اردو نے مولانا ابو الکلام آزاد کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے، جس میں ان کی مختلف حیثیتوں پر مقالات، نظموں اور قطعات تاریخ کے علاوہ ان کے متعدد فوٹو، خطوط کے عکس اور ان کی بلیغ اور ولولہ انگیز تحریروں کے اقتباسات شائع کئے ہیں، شروع میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، بخشی غلام محمد، حافظ ابراہیم اور مسز ارونا آصف علی وغیرہ کے پیام عقیدت بھی درج ہیں، اس نمبر کے لکھنے والے زیادہ تر مولانا کے عقیدت مند یا قریبی تعلق رکھنے والے ہی ہیں، اس لیے ان کی شخصیت بہت زیادہ اجاگر ہو گئی ہے، لایق مرتب نے اس نمبر کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ مولانا کی زندگی کے مختلف اور نمایاں پہلو واضح ہو جائیں، لیکن ان کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور جامع تھی کہ ایک نمبر کے ذریعہ ان کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس سے مولانا کے مختلف کمالات کی جھلک نظر آجاتی ہے، اور اس حیثیت سے یہ نمبر کامیاب ہے،

الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر - مرتبہ مولانا محمد عثمان فارقلیط، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۰، قیمت عہ، پتہ: (۱) الجمعیۃ بک ڈپو، قاسم پورہ، جان اسٹریٹ دہلی نمبر ۶

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی ذات ستودہ صفات علم و فضل، زہد و تقویٰ، سلوک و ارشاد، طریقت و شریعت، جہد و عمل اور پاکیزہ سیرت و کردار کی جامع اور سلف صالحین کا نمونہ تھی، الجمعیۃ یقیناً مبارک باد کے قابل ہے کہ اس نے حضرت مولانا کے شایانِ شان نمبر نکالا جس میں مولانا کے خلفا، مسترشدین، احباب، تلامذہ اور خصوصی تعلق رکھنے والوں نے ان کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اور حصہ تشنہ نہ رہنے پائے، لکھنے والوں میں مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، مولانا محمد طیب، مولانا محمد میاں، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور ڈاکٹر محمد اشرف وغیرہ قابل ذکر ہیں، کسی تحریر کے تمام پہلوؤں سے ہر شخص کا لفظ بلفظ اتفاق کرنا ضروری نہیں خصوصاً جب لکھنے والے تمام تر عقیدتمند ہوں تو بیان میں مبالغہ ہو جانا بعید نہیں ہے، مولانا کے کمال علم و عمل کے اثبات کے لیے ان کے مذہبی و سیاسی خیالات سے اختلاف رکھنے والوں کو مطعون کرنا ضروری نہیں، تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ خصوصاً جب کہ مولانا ابو الحسن علی کے بقول مولانا حسین احمد صاحبؒ کا عمل اس شعر پر تھا کہ

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ

اس قسم کی باتیں صرف دو تین مقالوں میں ہیں، ورنہ اکثر مقالے بہت مفید ہیں اور ان کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے بڑا مفید ہوگا کہ اس سے مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی انھیں توفیق ہوگی،

"ض"

مطبوعاتِ جدیدہ

صہبائے مینائی ۔ از جناب ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۸، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ مکتبۂ عارفین ۱۴۵ گورنمنٹ نیو مارکٹ، عظیم پور، ڈھاکہ۔ ہندوستان میں: حاجی محمد سعید اینڈ سنس، ناشران و تاجران کتب نمبر ۲۰ ویلسلی اسٹریٹ، کلکتہ ۱۳

قدیم اردو شاعری اپنی خامیوں کے باوجود نہ صرف ہمارے شعر و ادب کا بہترین سرمایہ بلکہ بہت سی اعلیٰ قدیم تہذیبی اقدار کی ترجمان بھی ہے، جدید شاعری کتنی ہی ترقی کر جائے مگر قدیم ادبی سرمایہ سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی، اس کی عمارت اسی پرانی بنیاد پر قائم ہے، اس دور کے صاحب نظر ادیب بھی اس حقیقت کے معترف ہیں، پرانے اساتذہ میں داغ و امیر قدیم طرز کے آخری نمائندے اور اپنے اپنے رنگ کے استاد کامل تھے، اسی لیے اس زمانہ کے ایک خوش مذاق ادیب ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے انکی شاعری کی روشنی میں قدیم شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت دکھانے کی کوشش کی ہے، گلہائے داغ کی بہار وہ پہلے دکھا چکے ہیں، اب صہبائے مینائی پیش کی ہے، اس کتاب میں چار ابواب ہیں اور ان میں بالترتیب نفس شاعری، تغزل، امیر کی شاعری کے پس منظر، شخصیت، خاندانی حالات، علمی کمالات، تحقیقی کارناموں، صوفیانہ زندگی، شگفتہ مزاجی، داغ و امیر کے تعلقات اور ان کی غزل گوئی پر تبصرہ اور انکے شاعرانہ مقام کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں ان کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب پیش کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے قلم

ے ایک تقریظ ہے، لائق مؤلف نے بڑی محنت اور خوش مذاقی سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کی نمایاں خصوصیت، اس کی جامعیت، ادبی و شاعرانہ نکتہ سنجی اور جدت و قدامت کا معتدل امتزاج ہے، اس سے امیر کے حالات اور ان کے شاعرانہ کمالات کے ساتھ شعر و ادب کے بہت سے دلکش پہلو اور اس دور کے ادبی و تہذیبی ماحول کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، انداز بیان نہایت شگفتہ و دلکش ہے، اور وہ اپنے ادبی محاسن کے لحاظ سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اس کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی :- از منشی عبدالرحمن خاں صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۲۷، مجلد معہ رنگین گرد پوش، قیمت سے، پتہ: ادارۂ نشر المعارف چھلیک ملتان شہر۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں تخیل پاکستان اور تحریک پاکستان کی ضرورت و اسباب اور اس کے بعد یہاں اسلامی آئین و قوانین کے نفاذ میں علماء کی مساعی اور جد و جہد پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ پاکستان کا تخیل ڈاکٹر اقبال کے بجائے سب سے پہلے حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے پیش کیا تھا، اس سے تعجب ضرور ہوتا ہے، مگر مصنف نے اسے ثقہ لوگوں کی روایات اور دلائل سے ثابت کیا ہے، ایک باب میں قائد اعظم محمد علی جناح کے تدین کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دینی و عملی تربیت میں مولانا تھانویؒ کا خاص حصہ تھا، کتاب کے اکثر حصوں میں جماعت اسلامی پاکستان اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طرز عمل سے بحث کی گئی ہے کہ وہ شروع میں قیام پاکستان کے مخالف تھے اور اس کے بننے کے بعد متعدد مسائل میں ان کی پالیسی سے پاکستان کو نقصان پہنچا اور اس کے دینی رجحان اور اسلامی نظام کے لیے فضا سازگار بنانے میں جماعت اسلامی کا نہیں بلکہ علمائے اشرفیہ کا بڑا دخل تھا،

یہ ان کی ذاتی رائے ہے، جو ممکن ہے صحیح ہو لیکن اس بحث میں مصنف کا لہجہ درشت، مناظرانہ اور انداز تحریر عامیانہ ہوگیا ہے، انھوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ اور دینی جماعت بتایا ہے، حالانکہ علماء کی اکثریت اس کے خلاف تھی اور اس کے دینی جماعت ہونے کا سارا راز پاکستان بننے کے بعد فاش ہوگیا، کتاب دلچسپ اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، اس سے گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں،

تذکرۂ نادر :- مرتبہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۸ قیمت عگر پتہ: کتاب نگر دین دیال روڈ، لاہور۔

اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر جنگ نادر رئیس بنارس، شاعری میں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، دیوان غریب ان کے مخمسوں کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے ۵۲۱ شاعروں کی غزلوں کا مخمس کیا ہے اور ان کے ضروری حالات تحریر کیے ہیں، اس دیوان کا ایک بوسیدہ اور کہنہ نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتبخانہ میں موجود تھا، جس کے خستگی و بوسیدگی کے باعث ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے رضوی صاحب نے جنھیں قدیم ادبی یادگاروں سے عشق ہے تذکرۂ نادر کے نام سے اس کو شائع کر دیا ہے، اور شروع میں نادر کے مختصر حالات و واقعات تحریر کیے ہیں اور اس کی تصنیفات نظم و نثر کا بھی ذکر کیا ہے، اس تذکرہ میں بہت سے ایسے غیر معروف شاعروں کا نمونۂ کلام اور تذکرہ درج ہے، جن کا ذکر دوسرے تذکروں میں نہیں ملتا، اس لحاظ سے یہ تذکرہ اہم ہے، اور اس کو مرتب اور شائع کرکے فاضل مرتب نے ایک مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے،

المنتخبات العربیۃ قسم النظم :- مرتبہ مولانا محبوب الرحمن و ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرار مدرسہ عالیہ کلکتہ، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت پتہ عثمانیہ بکڈپو ۱۰۴ لورچیت پور روڈ، کلکتہ نمبر ۱

اس مختصر مجموعہ میں پہلی صدی ہجری سے لیکر موجودہ دور تک کے چند عربی شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، جو ہر لحاظ سے جامع اور معیاری تو نہیں لیکن فائدہ سے خالی نہیں، اسے مغربی بنگال کے درجۂ عالم کے طلبہ کے لیے مرتب کیا گیا ہے، مگر عربی زبان و ادب کے عام شائقین بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ ہے۔

متاع کلیم:- از جناب کلیم احمد آبادی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت للعہ پتہ: کلیم بکڈپو، خاص بازار احمد آباد۔

جناب کلیم گجرات کے ایک گمنام مگر سن رسیدہ شاعر ہیں، یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو آخری دور کے کلام پر مشتمل ہے، جب کہ ان کی شاعری مجاز کی منزل سے گذر کر حقیقت و عرفان کے مقام پر پہنچ چکی ہے، اس لیے اس میں عشق و محبت کی واردات کے ساتھ سوز و گداز اور جذب و مستی کی بھی کیفیتیں ہیں، اس مجموعہ میں فن اور زبان کی معمولی خامیاں کہیں کہیں نظر آتی ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے متاع کلیم اصحاب ذوق کی قدر دانی کے لائق ہے، مجموعہ کے شروع میں مصنف کی شاعری پر مختصر تبصرہ اور ان کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور اس کی تقریب دارالمصنفین کے سابق اور دیرینہ رفیق جناب نجیب اشرف صاحب ندوی نے لکھی ہے۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات:- از جناب اسرار احمد صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۱۰۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ﷲ، ناشر مکتبہ برہان، جامع مسجد، دہلی۔

اس سے پہلے اس کتاب کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ جلد ثانی کا دوسرا حصہ ہے، اس میں تجارتی معاہدات، واقعات، محاربات، اجتماعات، مختصرات اور متفرقات کے عنوانات کے تحت، سیاسی اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے، سیاسی مسائل میں آئے دن کی تبدیلیوں کی وجہ سے پہلی اور دوسری جلد حصہ اول کے تتمے بھی اسمیں شامل کر دیے ہیں، مصنف جیشنلسٹ اور نیم اشتراکی ہیں، انکے یہ رجحانات کتاب میں بھی کہیں کہیں نمایاں ہیں، موجودہ سیاسی اصطلاحات و الفاظ کے سمجھنے کے لیے یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

"ض"

جلد ۸۴ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء نمبر ۳

مضامین